امریکہ رے امریکہ!

طارق اسمٰعیل ساگر

بسم الله الرحمن الرحيم

امریکہ رے امریکہ

سفرنامہ

طارق اسمٰعیل ساگر

مکتبہ القریش چوک اردو بازار لاہور ۲

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر	محمد علی قریشی
مطبع	معراج الدین پرنٹر
تعداد	ایک ہزار
بار اول	۱۹۹۲
قیمت	10.0 /-

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور

انتساب

الف کے نام

کسی کا دردہو کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلہ ہے جو بھی کسی سے تیرے سبب سے ہے

زندگانی رہروِ راہِ فنا ہے اے اسدؔ
ہر نفس ہستی سے تا مُلکِ عدم اِک جادہ ہے

(اسداللہ غالب)

بات کہنے کی نہیں!

امریکنوں سے خدا سمجھے!
ان کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔
220 کے بجائے 110 وولٹ بجلی استعمال کرتے ہیں۔
جس طرح ہم بجلی جلاتے ہیں' یہ اس طرح بجھاتے ہیں اور جس طرح ہم بجھاتے ہیں یہ اس طرح جلاتے ہیں۔
KEEP TO THE LEFT بچپن سے یہی پڑھتے آرہے تھے۔
امریکہ میں پڑھا سنا غلط ثابت ہوا۔ امریکن دائیں ہاتھ چلتے ہیں۔ بائیں ہاتھ ڈرائیونگ کرتے ہیں کسی بھی پاکستانی کے لئے جو امریکہ جائے پہلا سبق یہی ہے کہ اپنے پڑھے' لکھے' کہے' سنے پر اعتماد نہ کرنا ورنہ امریکہ کم اور امریکی ہسپتال زیادہ دیکھنے پڑیں گے۔
پیدائش سے وفات تک ہمارے ہاں بھی سرٹیفکیٹ جاری ہوتے ہیں ان پر امیدوار کے بعد ولدیت درج ہوتی ہے۔
لیکن -----
امریکنوں کے لئے "والد" کوئی مسئلہ نہیں۔
یہاں امیدوار کی والدہ کا نام درج ہوتا ہے۔
اس سے یہ ہرگز نہ جان لیجئے کہ امریکن باپ سے زیادہ ماں کی عزت کرتے ہیں اس معاملے میں جتنی مساوات آپ کو یورپ اور امریکہ میں دیکھنے کو ملے گی شاید اور

کہیں نہ مل سکے۔
عرض کرنے سے مطلب یہ ہے کہ امریکی ماں اور باپ دونوں کی ہی عزت نہیں کرتے یا پھر دونوں کی عزت کرتے ہیں۔ خیر ہم اس چکر میں نہیں پڑتے۔
میں تو آپ کو یہ بتانے جا رہا تھا کہ ضروری نہیں امریکن بچوں کے "والد" بھی

ہوں

عموماً یہ لوگ "والدہ" سے ہی کام چلا لیتے ہیں۔

کسی فرانسیسی نے امریکنوں کو طعنہ دیا تھا کہ جب امریکن فارغ ہوں اپنا باپ تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔
قیامت کے روز میدان حشر میں سب کو ماں کی نسبت سے پکارا جائے گا۔ سنا تھا۔

عمل کرتے اس دنیا میں امریکیوں کو دیکھ لیا ہے۔
"حرامی بچوں" کا تناسب یہاں کیا ہے؟
اسی ایک بات سے اندازہ فرما لیجئے۔
میں نے امریکہ 88ء سے 91ء تک 4 مرتبہ گھوما ہے---- اور خوب گھوما ہے۔
لیکن ----
ایک وضاحت آغاز ہی میں کر دوں کہ میں نے امریکہ کو گھوڑے، گڑیا یا گدھے کی نہیں انسان اور پاکستانی کی آنکھ سے دیکھا ہے۔
میرے پاس "دور اندر تک" جھانک لینے والی نظر تو نہیں ہے اس لئے ممکن ہے کہ آپ کو "دور اندر تک" کی باتیں نہ بتا سکوں۔
لیکن!
وہ بہت کچھ ضرور دکھا دوں گا جو میں نے دیکھا اور جیسا محسوس کیا۔
میں نے امریکہ میں سطح زمین پر ہی نہیں، زیر زمین بھی سفر کیا ہے۔ (مراد ہے سب وے)
سمندروں پر چلا اور ہواؤں میں اڑا ہوں۔
یوں دیکھا ہے کہ دیکھنے کا حق ادا ہو جائے۔

لیکن کسی تعصب سے نہیں۔

کھلے ذہن اور کھلی آنکھوں سے۔ یہ الگ بات کہ خطا کار ہونے کے باوجود کبھی کبھی اس بندہ ناچیز کو بعض مناظر کی تاب نہ لا کر آنکھیں بند بھی کرنا پڑیں۔

جی ہاں!

جیسے کبھی کبھی ہم اپنے ملک میں ہونے والے بعض واقعات پر' اپنے گردا گرد ہونے والے احتجاج پر گھبرا کر اپنے کان بند کر لیا کرتے ہیں۔

بعینہ امریکہ میں بسا اوقات بعض مناظر کو دیکھ کر آنکھیں بند کرنا پڑتی ہیں اور یہی نہیں بلکہ کان لپیٹ کر نکل جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔

مثلاً واشنگٹن' نیویارک یا فلاڈلفیا کی کسی سٹریٹ پر اگر کوئی کالا یا گورا امریکی غنڈہ کسی کی جان لے رہا ہے۔

کسی کو لوٹ رہا ہے۔

کسی پر تشدد کر رہا ہے۔

ان واقعات پر غیرت یا طیش کھانا آپ کی صحت کے لئے اتنا نقصان دہ ثابت ہو گا کہ پھر مدتوں آپ ناصح بنے رہیں گے۔ میرا مطلب ہے اپنے احباب کو سمجھاتے رہیں گے کہ جو غلطی آپ نے کی ہے وہ کوئی دوسرا نہ دھرائے۔

طاہرہ کے گلے سے ایک کالے نے سونے کی چین کھینچ لی اور یہ حادثہ اس کے گھر سے بمشکل دو فرلانگ کے فاصلے پر پیش آیا۔ جہاں سے وہ ہزاروں مرتبہ گزر چکی تھی۔

یہ اس کا معمول کا راستہ تھا۔

جس کالے نے یہ حرکت کی طاہرہ اسے پہچانتی تھی۔

لیکن ------

اس کے لئے صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

میں نے اسے بار بار کہا کہ وہ پولیس کو اس کالے کے متعلق بتا کیوں نہیں دیتی اس کا جواب یہی تھا کہ یہاں کے حالات کو تم نہیں سمجھ سکتے۔

دراصل ماضی میں وہ ایسی غلطی کا ارتکاب کر چکی تھی۔

میں نے امریکہ اور یورپ دیکھنے سے پہلے اپنے ایک سفرنامہ نگار صاحب کی تخلیقات کا بے تحاشہ مطالعہ کیا تھا۔ یہ صاحب ہمارے ملک کے مشہور سفرنامہ نگاروں میں سے ایک اور بزعم خود کوئی "وکھری قسم کی چیز" سمجھتے ہیں۔

ان کے سفرناموں کو پڑھنے کے بعد ایک بات تو اپنے ایقان کا حصہ محسوس ہونے لگی تھی کہ سارے یورپ اور امریکہ کی گوری میمیں بانہیں پھیلائے ہم ایشیئن رنگدار نسل کے لوگوں کی منتظر ہوتی ہیں اور جیسے ہی ہم ایئر پورٹ پر قدم رکھیں گے بے شمار حسینائیں ہمارے استقبال کو جھپٹیں گی وغیرہ وغیرہ—!

لیکن ----!

صاحبو! واقعہ یہ ہے کہ گوری تو کیا کسی کالی میم کو بھی جب ہماری قومیت کا علم ہو جائے تو عام پاکستانی کے لئے خود کو "جنٹل مین " ثابت کرنا مسئلہ بن جاتا ہے۔

اب یہ الگ بات کہ امریکن "جنٹل مین" کیسے سمجھتے ہیں۔

کوئی راندہ درگاہ امریکن عورت کسی پاکستانی کے چکر میں پھنس جائے تو کچھ کہا نہیں جا سکتا عام حالت میں وہ کچھ ہرگز نہیں ہوتا جو ہمارے سفرنامہ نگار صاحب فرماتے رہے ہیں ----!

ایک صاحب نے لکھا کہ یورپیئن کو ہمارے دانت بہت پسند ہیں۔ کیونکہ ہمارے دانت اکثر سفید ہوتے ہیں اور ان کے مقامی آب و ہوا اور اشیائے خورد و نوش کے بے تحاشہ استعمال کے سبب سفید نہیں رہتے۔

یہاں آکر دیکھا کہ ان کو سوائے ہاتھی دانت کے اور کوئی دانت پسند نہیں وہ بھی شاید اس لئے کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور' اور دکھانے کے اور ہوتے ہیں۔

1992ء میں کسی امریکی کو اپنے "پاکستانی بااصول اور ایماندار" ہونے کا یقین دلانا بہت مشکل ہے۔

اس سے یہ مطلب نہ لیجئے کہ امریکن کوئی آسمانی مخلوق ہیں' آپ کو ان کی اوقات کا علم بھی اس کتاب کے مطالعے سے ہو جائے گا۔

دراصل یہ امریکنوں کی پلاننگ کا حصہ ہے۔

وہ لوگ ہماری طرح ہوا میں تیر نہیں چلاتے۔ کچھ فیصلے قومی سطح پر بڑی سوچ بچار کے بعد کئے جاتے ہیں اور ان پر پھر بڑی منصوبہ بندی سے عمل کیا اور کرایا جاتا ہے ----- شاید اس مثال سے آپ کو بات کی سمجھ آ جائے۔

کیلے فورنیا میں ڈاکٹر گریوال کے گھر مجھے ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کو نزدیک سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

امریکن بچے کمپیوٹر پر نو عمری میں کمانڈ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ بچہ ہمارے حساب سے پانچویں جماعت کا طالب علم تھا اور اس روز اپنے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا مصروف تدریس تھا۔ مجھے ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ ان کمپیوٹرز کے لئے تمام پروگرام تیار شدہ مل جاتے ہیں مثلاً اس بچے کے پاس امریکن انسائیکلو پیڈیا اس ضمن میں موجود تھا۔ جس کا عملی مظاہرہ اس نے یوں کیا کہ ایک ڈسک اٹھا کر مشین میں ڈالی اور مجھ سے کہا کہ آپ دنیا کے کس ملک کے متعلق جاننا چاہتے ہیں۔

خاکسار نے فوراً اپنے ملک کا نام لے دیا کیونکہ بطور پاکستانی ہمیں سب سے "کم معلومات" اپنے ملک سے متعلق ہی حاصل ہوتی ہیں۔

ٹک ٹک ٹک ٹک

آوازیں نکلیں اور سکرین پر پاکستانی کا نام آیا۔ دل کی دھڑکن بے قابو ہوئی کہ دیکھوں اس ارض پاک سے متعلق امریکن کیا جانتے اور بتاتے ہیں----

سکرین پر باری باری معلومات آتی اور جاتی رہیں' کبھی پاکستان کا محل وقوع' کبھی آب و ہوا' کبھی موسم' کبھی صوبوں' شہروں کا جغرافیہ وغیرہ وغیرہ۔

اب سکرین پر پاکستانی تجارت کی تفصیلات آنے لگیں اور اچانک ہی یوں لگا جیسے کسی نے پورے زور سے میرے دل پر گھونسہ دے مارا ہو۔

سکرین پر پاکستانی درآمدات اور برآمدات کی تفصیلات آ رہی تھیں اور برآمدات میں باقی چیزوں کے ساتھ ساتھ ایک فقرہ نمایاں حروف میں لکھا تھا۔

"غیر قانونی برآمد ڈرگز (ہیروئن)"

یہ معلومات امریکن بچوں کے نصاب کا حصہ ہیں جو انہیں سکول میں پڑھائی جاتی ہیں اور پاکستان سے متعلق یہی تصور لے کر یہ بچے جوان ہوتے ہیں۔

یہی "قیمتی معلومات" حاصل کرنے کے بعد یہ امریکن نوجوان حکومتی عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔

اور یہی نوجوان پھر ویزہ آفیسر' نائب قونصلیٹ' قونصل جنرل وغیرہ وغیرہ بن کر لاہور کراچی پشاور وغیرہ میں تعینات ہوتے ہیں۔

اب آپ کو سمجھ آجانی چاہئے کہ امریکن ویزہ آفیسروں کا رویہ پاکستانیوں کے ساتھ اتنا تضحیک آمیز اور بسا اوقات طیش دلا دینے والا کیوں ہوتا ہے؟

ان بے چاروں کا قصور کیا ہے؟ انہیں یہی پڑھایا' سمجھایا اور بتایا گیا ہے۔

○

میں جانتا ہوں سرکاری عمال کے کان پر میری اس بات کو سن کر جوں نہیں رینگنے گی میں نے 89ء میں جب میں اس "حادثے" سے گذرا اپنی پاکستانی غیرت اور حمیت کے ہاتھوں جذباتی ہو کر بڑے دکھی دل سے اپنے محکمہ تعلیم' وزارت خارجہ اور پرائم منسٹر ہاؤس کو اس حادثے کے تفصیلات کے ساتھ خطوط لکھے تھے۔

میں جانتا ہوں کہ جن سیکشن آفیسروں نے ان خطوط کو پڑھا ہو گا وہ مجھے بے وقوف سمجھ کر مسکرائے ہوں گے اس سے زیادہ رد عمل کی توقع مجھے تھی بھی نہیں۔

میں نے تو اپنا اخلاقی فرض نبھایا کیونکہ میں اپنی زمین کا کھا کر' اس کے خلاف ایسی کیونکہ سطحی نوعیت کی گالی برداشت نہیں کر سکتا کہ میری جڑیں اس زمین میں ہیں۔ اور میں "منی پلانٹ" نہیں ہوں۔

مجھے برساتی مینڈکوں' خود رو پودوں اور پلانٹس کا علم ہے۔ میں ان سے متعلق کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوں۔

مجھے علم ہے کہ ہمارے حکمران پاکستانی کم اور امریکہ کے گداگر زیادہ ہیں ---- ان کے اپنے مفادات ہیں۔

اپنا سوچنے کا الگ انداز ہے۔

لیکن ----

میرا تعلق خواص سے نہیں عوام سے ہے۔

میں پہلے پاکستانی بعد میں کچھ اور ہوں۔
آپ مجھے وطن پرستی کا طعنہ دیں یا گمراہ ہونے کی گالی سے نوازیں۔
لیکن ---- !
مجھ سے پاکستانی ہونے کا حق نہیں چھین سکتے۔

بہرکیف یہ واقعہ لکھنے سے میرا مقصود تھا کہ آپ کو علم ہو جائے کہ پاکستان سے متعلق ایسے نظریات رکھنا امریکی نصاب تعلیم کا حصہ ہے اور یہی تعلیم پاکستانی والدین کے بچے بھی حاصل کرتے ہیں اگر ان کے پاکستانی نژاد والدین انہیں بتاتے بھی رہیں کہ ان کا "اصل" کیا ہے تو اس سے فرق کیا پڑے گا۔ جلد ہی وہ اپنے والدین کو بے وقوف سمجھنے لگتے ہیں۔

اول تو بہت کم والدین ایسے ہیں جو اپنی ضد پر قائم رہیں اکثر خود کو پھر بادل نخواستہ یا شوق سے ہی امریکن بنا لیتے ہیں جو نہیں بناتے ان کے بچے ان کے لئے مستقل ذہنی اور روحانی عذاب بن جاتے ہیں۔

احمقوں کی جنت میں رہنے والے اگر کچھ لوگ اس بات پر بضد ہیں کہ اپنے گھر میں قرآن پاک، پنجسورہ، قرآنی قاعدہ کچھ پاکستانی رسالے کتابیں رکھ کر یا ڈرائنگ روم میں انارکلی کے کسی بازار میں ہنڈی کرافٹ کی دکان سے خرید کردہ کوئی پاکستانی سجاوٹ کی چیزیں رکھ کر خانہ کعبہ کی تصویر یا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور کلمہ طیبہ کے کتبے کچن اور سٹنگ روم کی دیواروں پر سجا کر وہ اپنے بچوں کا رابطہ اپنی زمین سے جوڑ سکتے ہیں تو ان کی مرضی۔

حقائق کچھ اور ہیں ----
خاصے تلخ اور جان لیوا---

تاثر جو بھی دیا جائے عمل اس کے برعکس ہو رہا ہے۔ پاکستان نژاد گھرانوں میں کچھ پاکستانیوں کو (جو بلاشبہ ہمارا فخر ہیں) چھوڑ کر زیادہ تعداد ان کی ہے جن کی عورتیں اپنے خاوند کے ڈانٹنے پر پولیس طلب کر لیتی ہیں۔

جن کی بچیاں بے راہروی کا شکار ہیں۔
جن کے بچے انہیں اپنے والدین ماننے سے ہی انکاری ہیں۔

پریشان کر دینے والی بات یہ ہے کہ جن عورتوں کا میں نے تذکرہ کیا وہ بہت تعلیم یافتہ نہیں پاکستان کی دس بارہ جماعتیں پڑھی ہوتی ہیں۔ ان کا تعلق بھی بہت ماڈرن

گھرانوں سے نہیں بلکہ بیشتر کا تعلق پاکستانی شہروں کے قدیم محلوں سے ہے یہ الگ بات کہ اندرون لاہور شہر کی جو خاتون امریکہ میں بیاہی جائے وہ کچھ عرصہ بعد خود کو گلبرگ یا کسی اور "پوش علاقے" سے متعلق بتانے لگتی ہے۔

○

"امریکی پاکستانی" ہمارے ہاں بھی بہت پائے جاتے ہیں اور امریکہ میں تو ہیں ہی ...!

پاکستان کا رزق کھا کر پلنے والے'
پاکستانی پاسپورٹوں پر امریکہ جانے والے۔
یہ وہ بد بخت پاکستانی ہیں جو گرین کارڈ ملنے پر پہلی گالی اپنی دھرتی ماں کو دیتے ہیں۔

بالٹی مور کا رہائشی 'گجرات کے نزدیکی گاؤں "کنجاہ" کا پیدائشی جس نے محض اپنے ایک ہندو ہمسایئے کو خوش کرنے کے لئے اپنی بیٹی کی سالگرہ کی تقریب میں میرے سامنے اپنی زمین کو گالی دی تھی۔

پاکستان میں مصائب و مشکلات کو ہزار چند بنا کر بیان کیا تھا----

جس نے جھوٹ کی انتہا کرتے ہوئے مجھے کہا تھا کہ اس نے کراچی ایئر پورٹ سے پانی کا گلاس دس روپے میں خریدا تھا۔

"زمین کا کوڑھ" ہے ---!

لعنت ہے اس پر جس نے "کنجاہ" کے غیرت مندوں سے اپنا جھوٹا تعلق ظاہر کیا ---- شاید اس گدھے کو اس بات کا علم نہیں کہ جس زمین سے اس نے اپنا جھوٹا ناطہ قائم کیا ہے اس نے پاکستان کی ہریالی میں کتنے شہیدوں کا لہو شامل کیا ہے-----

میں جانتا ہوں جب وہ مرے گا تو اس کی لاش دفن ہونے کے لئے یہاں لائی جائے گی۔

لیکن -----

وہ نہیں جانتا کہ اگر اس گاؤں کے لوگوں کو اس کی اصلیت کا علم ہو گیا تو وہ

اپنے گاؤں میں اس کی لاش بھی دفن نہیں ہونے دیں گے۔

یہ بدبخت ساری زندگی امریکہ میں بیٹھ کر پاکستان کے خالف ہذیان بکتے ہیں اور مرنے کے بعد دفن ہونے کے لئے یہاں آجاتے ہیں۔

مجھے زیادہ علم نہیں لیکن ایک مرتبہ لندن سے اسلام آباد آتے ہوئے ایک غیرت مند پاکستانی جو جرمن سے آرہے تھے نے مجھے بتایا تھا کہ جرمن میں ترک مسلمان زیادہ ہیں اور ترکی کا یہ قانون ہے کہ جس ترکی نژاد مسلمان نے جرمنی کی شہریت اپنا لی ہو وہ اسکی لاش کو ترکی میں دفن کرنے کی اجازت نہیں دیتے -----!

خدا کرے پاکستان میں بھی کوئی غیرت مند حکمران یہ قانون بنا جائے ----!

اپنی زمین کے ان غداروں کو پھر عیسائیوں کے قبرستانوں میں دفن ہونا پڑے۔

افسوس ان پاکستانیوں نے اپنی جڑوں سے کٹ کر جینے کا بھونڈا اور غیر قدرتی راستہ اپنایا۔

لیکن -----!

یہ لوگ پاکستان کی پہچان نہیں ----!

اگر وہ خود کو پاکستانی نہیں سمجھتے تو پاکستان کو بھی ان کی ضرورت نہیں۔

ہماری پہچان نیو یارک اور لاس اینجلس کے وہ ہزاروں پاکستانی نوجوان طلباء طالبات' ڈاکٹر' انجینئر' سائنسدان ہیں جو دن رات پاکستان کا دم بھرتے ہیں۔

جو ایک لمحے کے لئے بھی خود کو اپنی زمین سے الگ نہیں کرپاتے۔

جو اسی حوالے کے ساتھ جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

امریکہ میں سید جعفر حسین' میاں محمود قریشی اور عبدالرزاق ملک جیسے پاکستانی بھی آباد ہیں۔ یہی لوگ پاکستان کی آبرو ہیں۔

پاکستان کا فخر ہیں ----!

پاکستان کو ان پر مان ہے!

طارق اسمٰعیل ساگر

84 راوی روڈ۔ لاہور

امریکہ دنیا کا سب سے بڑا مقروض ہے اس کی فلک بوس اور بلند و بالا عمارات پر نہ جائیے رات کے دوسرے پہر سردی سے ٹھٹھرتے انسانوں کے اس ابنوہ کثیر پر نظر ڈالیے جوان بلڈنگوں کے کونوں کھدروں میں' پارکوں میں' ریلوے سٹیشنوں' سب وے اور ہوائی اڈوں کی عمارتوں میں رات بسر کرنے کے لیے چھپکے نظر آتے ہیں

صرف نیویارک میں ۵ لاکھ عورتیں جسم فروشی کے ذریعے اپنا نان نفقہ چلاتی ہیں روزانہ نیو یارک میں ایک لاکھ سے زائد افراد کو پارکوں میں رات بسر کرنا پڑتی ہے امریکہ میں ہر پندرہ منٹ کے بعد کوئی خاوند یا بوائے فرینڈ اپنی بیوی یا داشتہ کو جسمانی تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ یہاں کی ۸۰ فیصد شادی شدہ عورتوں کے غیر مردوں سے اور ۹۰ فیصد شادی شدہ مردوں کے غیر عورتوں سے تعلقات استوار ہیں امریکہ کی ہر چوتھی فیملی میں ون پیرنٹ چائلڈ موجود ہے امریکہ کا ۷ سال کی عمر تک کا ہر چوتھا بچہ جنسی ہوس کا شکار ہو چکا ہے۔

جی ہاں! یہی ہے وہ امریکہ جس نے اپنی معیشت اور معاشرت کی مضبوط بنیادیں استوار کرنے کے لیے سب سے پہلے ۲ ملین لوگوں کو ایشیا سے لاکر امریکہ میں آباد کیا تھا اور جہاں اب ایشیائی لوگوں کے داخلے بند کرنے کے لیے تمام قانونی شکنجے حرکت میں لائے جا رہے ہیں ۸۰ فیصد یورپین نسل کی آبادی والے ملک امریکہ کو دیکھنے کا شوق مجھے بھی کشاں کشاں امریکہ لے گیا۔ پہلے مرتبہ میں نے 1988ء میں امریکہ کا دورہ کیا۔ اپنی آمد پر جس پہلے عظیم الشان صدمے سے دو چار ہونا پڑا وہ پی آئی اے

کی متعلقہ فلائٹ سے ۱۴ پاکستانیوں کی واپسی تھی

یہ صاحبان جعلی پاسپورٹوں اور سفری دستاویزات کے ذریعہ امریکہ میں داخل ہونا چاہتے تھے اور اس قوم کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے خواہش مند تھے جو اپنی آنکھ کے شہتیر کے علاوہ سب کچھ دیکھ لینے پر قادر ہے۔

ظاہر ہے میری آمد یہاں کسی خوشگوار ماحول میں نہیں ہوئی تھی اور مجھے بھی ان کڑے مراحل سے دوچار ہونے کے بعد امریکہ میں داخلے کی اجازت ملی جس سے ہر پاکستانی کو دوچار ہونا پڑتا ہے میری صحافیانہ حیثیت کے پیش نظر امیگریشن آفیسر خاتون نے مجھے یہ اطلاع دینا ضروری جانا کہ جس پرواز سے میں یہاں پہنچا ہوں اس سے ۱۴ پاکستانیوں کو "امریکہ بدر" بھی کیا جارہا ہے اطلاع دینے کا انداز طنزیہ تھا یا دھمکی آمیز اس کا اندازہ تب مجھے یوں نہ ہو سکا کہ میری تمام تر توجہ باہر موجود میزبانوں پر مرکوز تھی ایک تو فلائٹ ہی خیر سے ۴ گھنٹے تاخیر سے روانہ ہوئی اس پر مستزاد یہ کہ امیگریشن سے میرا چھٹکارا ایک گھنٹے بعد ہوا کیونکہ یہ ۱۴ کا ٹولہ مجھ سے پہلے ہی قطار میں کھڑا ہو چکا تھا۔

○

کسٹم پر میں نے رضاکارانہ طور پر سامان کھول کر چیک کروانا زیادہ مناسب جانا بصورت دیگر بھی یہی کچھ ہوتا کیونکہ یہاں پاکستانی فلائٹس سے آنے والوں کے لیے کوئی "گرین چینل" موجود نہیں۔

بہرکیف میرے اس رضاکارانہ جذبے نے نیگرو کسٹم خاتون آفیسر کو متاثر کیا اور اس نے ایک سرسری نظر ڈالنے پر ہی اکتفا کیا اور مسکراہٹ کے ساتھ مجھے رخصت ہونے کی اجازت دے دی۔ باہر کوئی میرا منتظر نہیں تھا کیونکہ امریکہ میں کم از کم ۵ گھنٹے کوئی کسی کا انتظار نہیں کیا کرتا فون کر کے ایک سکھ دوست کو اپنی آمد سے مطلع کیا اور رات محفوظ گزارنے کا سامان ہوا اس واقع کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ نیویارک میں پی آئی اے کی کارکردگی اگر اطمینان بخش بھی ہے تو کم از کم

امریکہ میں موجود دیگر ایرلائنوں کے معیار کی ہرگز نہیں۔

شاید ہی کبھی آپ کو یہاں سے علم ہو سکے کہ فلاں پی آئی اے کی فلائٹ جو پاکستان سے فلاں وقت روانہ ہوئی تھی کب اور کس وقت نیویارک پہنچے گی۔

جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں اس میں قصور شاید ان لوگوں کا بھی نہیں ہے یہ کہنے میں کوئی باق نہیں کہ یورپینوں کا روائتی تعصب جو ہمارے تئیں روا رکھتے ہیں اس کی وجہ ہے -----

حیرت کی بات ہے کہ پی آئی اے کے ساتھ امریکن بالکل سوتیلی ماں کا سلوک کرتے ہیں شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ پاکستان کے کسی ایئرپورٹ سے کوئی امریکن جہاز نہ پرواز کرتا ہے نہ لینڈ کرتا ہے۔ عموماً بہت دیر تک پرواز کرنے کے بعد ہی پی آئی اے کے جہاز کو نیویارک کے جے ایف کینڈی ائرپورٹ پر اترنے کی اجازت ملتی ہے۔

کئی دفعہ تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ جہاز کو نیویارک کی بجائے واشنگٹن بھیج دیا جاتا ہے جہاں تین چار گھنٹے مسافروں کو جہاز میں قید رکھنے کے بعد کیونکہ لاؤنج' میں جانے کی اجازت نہیں دی جاتی' جہاز کو دوبارہ نیویارک کی طرف جانے کی جازت ملتی ہے آپ حیران نہ ہوں ہم نے حسن ظن سے کام لیا ہے یہ وقفہ کبھی کبھی چھ گھنٹے بھی ہو جاتا ہے۔

خدا جانے یہ بزعم خویش مہذب اقوام آخر ہمیں کس جرم کی سزا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہمارے مسلم ممالک بھی کبھی کبھی نہ سمجھ میں آنے والی پالیسیاں اختیار کر لیتے ہیں مثلاً کراچی سے جو پی آئی اے کی پرواز تب براستہ قاہرہ' پیرس نیویارک جاتی تھی جب یہ پرواز قاہرہ پر رکی تو وہاں بھی ہمیں ٹرانزٹ میں جانے کی اجازت نہیں ملی۔

آخر پی آئی اے سے ایسا امتیازی سلوک کیوں؟

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں عموماً بڑے واقعات یا حادثات کا پیش خیمہ بنتی ہیں اور ان ہی اقدامات سے کسی بھی ملک کے شہریوں پر دوسرے ملک سے متعلق مثبت یا منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

○

نیویارک میں رات میں نے مین ہٹن میں اپنے بہت پیارے دوست گورووندر سنگھ کے ہاں بسر کی جس سے آپ کی ملاقات کسی اگلی نشست میں کراؤں گا------ اس سے پہلے گو کہ میں نے متعدد مرتبہ یورپی ممالک کا دورہ کیا ہے------ لیکن -----

امریکہ میں یہ میری پہلی آمد تھی اور میں واقعی محسوس کر رہا تھا کہ ایک الگ' جہان میں آگیا ہوں-----

ایک الگ سیارے میں آگیا ہوں-----

○

نیویارک دنیا کا شاید سب سے منفرد حیثیت کا حامل شہر ہے جس کا رقبہ ۳۱۹ اعشاریہ ۸ مربع میل ہے اور آبادی ۸۰ لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے نیویارک کو بنیادی طور پر ۵ بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

کوئنز ان میں سب سے بڑا حصہ ہے اس کے بعد مشہور عالم بروک لین ہے پھر برونکس، سٹیٹن' آئی لینڈ اور مین ہٹن۔

مین ہٹن پر ہی مشہور عالم ورلڈ فنانشنل سنٹر موجود ہے جہاں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی ۲۷۵ منزلہ عمارت اپنے دو عظیم الشان ٹاورز کے ساتھ ایستادہ ہے کبھی ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کو دنیا کی سب سے اونچی عمارت ہونے کا اعزاز حاصل تھا لیکن اب ایسا نہیں

ہے۔

مین ہنٹن کے ایک سے دوسرے کونے تک گھوم جائیے دنیا بھر کی معیشت کے اعصابی مراکز وال سٹریٹ سمیت یہیں موجود ہیں امریکن ایکسپریس کی بلڈنگ کے ساتھ ہی پھر ڈاؤن ٹاؤن شروع ہو جاتا ہے۔

مین ہنٹن آئی لینڈ کو ۵ پل نیویارک سے ملاتے ہیں اور ایک پل سے روزانہ ۲۔ لاکھ گاڑیوں اوسطاً گزرتی ہیں اگر براڈوے پر آیئے تو آپ کو مشہور عالم شاپنگ سنٹر "میسی" کے ساتھ ہی فلپائن کے صدر مارکوس کی وہ بلڈنگ بھی دکھائی دیتی ہے جو آج دونوں حکومتوں کے درمیان وجہ تنازعہ بنی ہوئی ہے یہ بلڈنگ ۳۴ ویں شاہرہ پر مارکوس کی بے بسی کی تصویر بنی نظر آتی ہے۔

اگر آپ نیویارک میں موجود ہوٹلوں، موٹلوں، تھیٹروں، میوزک اور ڈانس سنٹرز میوزیم، شاپنگ سنٹر، باغات اور دیگر تفریح گاہوں کا تفصیلی جائزہ لینا چاہئیں تو ماہرین کے اندازے کے مطابق آپ کو کم از کم ایک سال کا عرصہ درکار ہو گا۔

نیویارک کو امریکہ کا معاشی اور تجارتی مرکز ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے یہاں امریکن تعمیر و ترقی کے تمام اعصابی مراکز موجود ہیں جہاں ایک ایک رگ دبانے سے الگ الگ نتائج حاصل ہوتے ہیں اور یہاں بیٹھ کر ہی دراصل امریکن دنیا کی معیشت سے کھیلتے ہیں کبھی کبھی یہ کھیل مہنگا بھی پڑتا ہے ۸۸ کا "وال سٹریٹ کرائس" اس کی بہترین مثال ہے۔

○

۳۵ لاکھ افراد صرف نیویارک کے بنکوں، تعمیراتی پلانٹس اور فنانشل مراکز میں مصروف کار رہتے ہیں اور دفتری اوقات کار میں یہاں واقعی تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی نیویارک کے ٹیکسی ڈرائیوروں کو دیکھ کر پاکستان کی ڈرائیونگ بے ساختہ یاد آئی یہ

لوگ بھی ڈرائیونگ کے اصولوں کو اتنا ہی خاطر میں لاتے ہیں جتنا پاکستان کے ٹیکسی، ویگن اور رکشہ ڈرائیور۔

انسانی پستی کا بد ترین نظارہ یہاں کی رسوائے زمانہ ۴۲ سٹریٹ پر موجود ہے جہاں مشین میں ایک کوارٹر کا سکہ ڈالنے سے آپ چند منٹ تک جنسی بہمیت اور بے حسی کا بدترین نظارہ کر سکتے ہیں۔

اگر مین ہٹن سے آپ محفوظ نکل آئیں تو خوش قسمت ہیں بصورت دیگر آپ کو کسی نہ کسی حادثے سے دوچار ہونا پڑتا ہے مقامی نیگرو آبادی کے بگڑے ہوئے نوجوان اور نو عمر چند سکوں کے لئے آپ کو موت کے گھاٹ بھی اتار سکتے ہیں۔ یہاں دن کے اوقات میں کاروں کے دروازے اندر سے بند رکھے جاتے ہیں۔ رات کو تو یہاں سے گزرنے کا تصور ہی محال ہے اگر آپ کسی حادثے سے دوچار نہیں ہوئے تو کسی اور کے کسی حادثے سے دوچار ہونے کی خبر آپ کو ضرور مل جائے گی۔

○

نیو یارک اپنے اندر ایک جہان بسائے ہوئے ہے-------

ہمارے ملک سے خصوصاً وہ ایڈونچر پسند نوجوان جو یہاں ایجنٹوں کو لاکھوں روپے دے کر جعلی کاغذات پر امریکہ جاتے ہیں وہ عموماً پہلے نیو یارک ہی کو اپنا مسکن بناتے ہیں۔ خصوصاً مین ہٹن اور کوئینز میں آپ کو پاکستان اور بھارت کے باشندے زیادہ تعداد میں نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے مستقبل قریب میں کبھی ان دونوں کو لندن کے ساؤتھ ہال اور آل گیٹ والی حیثیت حاصل ہو جائے --------"

نیو یارک میں آپ کو اکثر وہ بدقسمت پاکستانی بھی مل جاتے ہیں جو امریکہ ڈالر کمانے کی دھن میں اپنا اثاثہ فروخت کر کے جیسے تیسے یہاں پہنچتے ہیں اور پھر حسرت ویاس کی تصویر بنے کسی گیس سٹیشن، فاسٹ فوڈ یا براڈوے کے کسی موڑ پر نظر آجاتے

ہیں۔ یہ وہ پاکستانی ہیں جو آنکھوں میں ہزاروں خواب سجا کر یہاں آئے تھے۔
لیکن--------

ایک ایک کر کے ان کے خواب پھر ٹوٹتے چلے گئے اور اب ان بے چاروں کی حالت دھوبی کے اس کتے والی ہو کر رہ گئی ہے جو نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا میں آپ کو ایسے کئی نوجوانوں کی کہانیاں سناؤں گا لیکن پہلے ایک اور ملاقات کا تذکرہ ہو جائے۔

جن دنوں میں نے امریکہ پہلا سفر کیا تھا۔ پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کی وفات کے بعد الیکشن ہوئے تھے اور پیپلز پارٹی نے زمام اقتدار سنبھالا تھا۔ پیپلز پارٹی کو چونکہ ۷۷ء کے گیارہ سال بعد اقتدار میں آنے کا موقعہ ملا تھا اور تب عام تاثر یہی تھا کہ پیپلز پارٹی امریکہ سے متعلق نرم گوشہ نہیں رکھتی اور ان حالات میں جب کہ جنرل ضیاء الحق ایک حادثے میں وفات پا گئے تھے۔

گیارہ سال بعد پاکستان میں جمہوریت کو دوبارہ زندگی ملی تھی کیونکہ اس سے پہلے جونیجو حکومت کو دنیا نے ابھی تک مکمل جمہوری حکومت تسلیم نہیں کیا تھا۔

امریکہ کو ہماری ساست میں کلیدی مقام حاصل رہا ہے اس لئے میری خواہش تھی کہ پاکستان میں آنے والی اس اہم تبدیلی کے حوالے سے امریکیوں کے تاثرات جان سکوں سردار گنگا سنگھ ڈھلوں کا نام پاکستانی اخبارات کے قارئین کے لئے جانا پہچانا نام ہے گنگا سنگھ خالصتان تحریک کے ابتدائی محرکین میں شمار ہوتے ہیں ان کی ایک انتہائی اہم خصوصیت ان کے امریکن سفارتی اور سیاسی حلقوں میں خصوصی تعلقات ہیں۔

○

مجھے اگلے روز مسٹر گنگا سنگھ ڈھلوں سے ملنے واشنگٹن جانا تھا جنہوں نے یہاں کچھ سینٹرز سے میری ملاقات کا بندوبست کروا رکھا تھا۔ اگلے روز سردار گنگا سنگھ کے ہاں واشنگٹن جا پہنچا جنہوں نے اسی روز دوپہر کو ڈاکٹر کیرا کاف سے انٹرویو کا وقت لے رکھا

تھا۔ ڈاکٹر کلف کیراکاف ری پبلکن سنٹرز کی فارن ریلیشنز کمیٹی میں ایڈوائزر ہیں اور ان کا قریبی تعلق ری پبلکن سینٹر جیسی ہیلمز سے ہے۔

ساؤتھ ایشا خصوصاً پاکستان بھارت اور افغان سیاسیات پر انہیں "اتھارٹی" گردانا جاتا ہے ری پبلکن حکومت کی فارن ریلیشنز کمیٹی میں ان کے کردار کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا واشنگٹن ڈی سی کی سینٹرز آفس بلڈنگ میں ڈاکٹر کیراکاف سے برصغیر کی موجودہ صورت حال اور پاکستان میں انتخابات کے حوالے سے جو گفتگو ہوئی وہ پیش خدمت ہے۔

سوال...... مسٹر کیراکاف پاکستان میں موجودہ انتخابات اور ان میں امریکہ کے کردار پر آپ کیا تبصرہ کریں گے کیونکہ پاکستان میں یہ تاثر عام پایا جاتا ہے کہ امریکہ نے ہمارے موجودہ انتخابات میں اپنا سیاسی اثر و رسوخ استعمال کیا ہے؟

جواب ...... جنرل ضیاء الحق کی موت کے بعد ہم خوف زدہ تھے کہ اب خدا جانے پاکستان کے حالات کیسے ہو جائیں یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہم ری پبلکن پاکستان دوستی کی شہرت رکھتے ہیں اس حوالے سے ہمیں پاکستان سے متعلق معاملات پر خاصی تشویش رہتی ہے اور یہ کوئی معمولی سانحہ نہیں تھا۔

لیکن

اس ضمن میں پاکستانی حکومت کو جتنی داد دی جائے وہ کم ہے کہ انہوں نے نہ صرف معاملات کو سنبھالا بلکہ پاکستان کی انتخابی تاریخ میں ایک روشن باب کا اضافہ بھی کر دیا اور غیر متنازعہ اور پر امن انتخابات کروا کر یہ ثابت کیا کہ پاکستان میں جمہوریت کی جڑیں بہت مضبوط ہیں یہاں میں خاص طور سے صدر غلام اسحاق خان آرمی کے چیف آف سٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ اور جیوڈیشری کے کردار کی تعریف کروں گا جنہوں نے مل کر پاکستانی قوم کی امنگوں کے مطابق ایک غیر جانبدارانہ اور منصفانہ انتخاب کے لئے فضا ہموار کی۔

آرمی کا رول خصوصاً قابل ذکر ہے آپ جانتے ہیں اس سے پہلے ۱۷ اگست کو

ایک سانحہ ہو چکا تھا اور فوج زبردست صدمے سے دو چار تھی ان حالات میں میں فوجی لیڈر شپ نے نہ صرف حالات کو سنبھالا بلکہ اپنی ذمہ داری کو بحسن و خوبی نبھاتے ہوئے ملک کے اندرونی حالات کو بھی سدھارا پھر جیوڈیشری نے دھاندلی کے امکانات کو ختم کرتے ہوئے پر امن انتخابات کے انعقاد کو ممکن بنایا۔ جہاں تک امریکی مداخلت کا تعلق ہے تو میں ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ امریکہ کو پاکستان کی سلامتی سے دلچسپی ہے نا کہ پاکستان کی سیاسی جماعتوں میں

واشنگٹن میں کچھ آوازیں اٹھیں کہ پاکستان جنرل ضیاء کے بعد کمزور ہو گیا ہے اور شاید اب سنبھل نہ سکے کیونکہ کراچی کے لسانی فسادات' افغان مسئلہ اور بھارتی دباؤ ہمارے محل نظر تھا لیکن ہم نے دیکھا انتخابات بر وقت ہوئے کیونکہ بنیادیں مضبوط تھیں۔

سوال ... الیکشن کے نتائج اور موجودہ حکومت کے قیام پر آپ کی رائے۔

جواب ... ہمارے ہاں امریکہ میں پریس نے اور کانگریس اور سینٹ کے بڑے حصے نے پاکستان میں فوجی یا سول آمریت کو کبھی پسند نہیں کیا شاید یہی وجہ تھی کہ پریس کے ایک بڑے حصے نے بطور سویلین محترمہ بے نظیر بھٹو کی حمایت کی اس کی ایک اور اہم وجہ ان کی شخصیت بھی ہے جس نے یہاں خاصی شہرت حاصل کی اور وہ مغربی اطوار سے بخوبی آگاہ ہونے کی وجہ سے یہاں کے پریس میں اہم مقام حاصل کرنے میں کامیاب رہیں۔ لیکن یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ بہت اچھی منتظم بھی ثابت ہوں وہ بہت ذہین ہیں سلجھی ہوئی خاتون ہیں لیکن ہم ان کے پروگرام کا مثبت نتیجہ دیکھنے کے خواہش مند ہیں اور اس میں ابھی وقت درکار ہے ہم پر امید ہیں اور صدر ضیا کی موت کے بعد پاکستان کو ایک مضبوط اور خوشحال ملک دیکھنے کے متمنی بھی ہیں۔

اگر ہم مسز بے نظیر کے ماضی کے بیانات دیکھیں تو صورت حال کچھ اچھی نظر

نہیں آتی خصوصاً امریکہ کے حوالے سے ان کا لہجہ ماضی بعید میں خاصا تند و تیز رہا ہے لیکن اب وہاں "چیک اینڈ بیلنس" کی صورت حال خاصی تسلی بخش ہے اور ہم پاکستان کی موجودہ کابینہ میں صاحب زادہ یعقوب خان جیسے دوست چہرے بھی دیکھ رہے ہیں اس کے علاوہ بھی ہمارے بہت سے دوست وہاں موجود ہیں اب ہم مسز بھٹو کی طرف سے "مثبت رزلٹ" چاہتے ہیں۔

سوال ..... پاکستان کی موجودہ حکومت کو آپ کے خیال میں کن فوری مسائل کا سامنا ہے؟

جواب..... محترمہ بے نظیر کی حکومت کو بہت سے چیلنج کا سامنا ہے جس میں سب سے زیادہ اہمیت ہم روسی خطرے کو دیتے ہیں اس مرحلے پر مجھے یہ بات نہیں کہنی چاہئے کیونکہ ہم روس کے ساتھ بہتر تعلقات استوار کر رہے ہیں حالانکہ ۱۷ اگست کے حادثے میں ہمارے محترم سفیر کو بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے لیکن امریکہ نے اس معاملے میں مداخلت نہیں کی۔

سوال..... آپ کے خیال میں گویا روس کا "کارنامہ" تھا؟

جواب..... میں وثوق سے یہ بات کہتا ہوں کہ اس حادثے میں روس نے ایک اہم رول ضرور ادا کیا ہے اس لیے نئی حکومت کو روسی خطرے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے نئی حکومت کو اس ضمن میں افغان مہاجرین کو بھی مطمئن رکھنا ضروری ہے

اس کے بعد سب سے بڑا خطرہ بھارت ہے اس حقیقت کو آپ کی نئی حکومت قبول کرے یا نہ کرے لیکن حقائق کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا اور جلد یا بدیر وہ اپنا آپ منوا کر رہتے ہیں۔ راجیو حکومت کے امریکہ سے اچھے تعلقات کے باوجود ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے لیے بھارتی فوجی خطرہ ہر وقت موجود ہے کیونکہ بھارت کی بالادستی اور تسلط کی خواہش کبھی ختم نہیں ہوگی سری لنکا اور اب مالدیپ کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں کمزور ہمسایہ ممالک کی امداد کے چکر میں ان پر غاصبانہ قبضہ کرنے کی ہندو کی تاریخ بہت پرانی ہے بہت مدت پہلے رام چندر اور لکشمن نے سری لنکا پر حملہ کر کے

راون کو تباہ کیا تھا اس فتح کی یاد ہندو آج تک "دسہرہ" کے ذریعے مناتے ہیں اور راون کو جلاتے ہیں آج یہی کردار بھارت کے موجودہ حکمران ادا کر رہے ہیں ہمارے لیے یہ اچنبھے کی بات نہیں ہندو اگر آج بھی ہزاروں سال گزرنے کے باوجود اپنے سری لنکن دشمن کو جلانے کا جشن مناتے ہیں تو ان کی فطرت ثانیہ ہے اگر پاکستانی وزیر اعظم یہ سمجھتی ہیں کہ اپنی نیک خواہشات سے وہ بھارتی بالادستی کے خطرے سے محفوظ ہو جائیں گی تو ان کی غلط فہمی ہے۔

بھارت روس کا حلیف اور حاشیہ بردار ہے اس بات میں کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بھارت کے ذریعے روس بحیرہ ہند میں اپنی بحری بالادستی کے خواب کو مکمل کرنا چاہتا ہے جس کا ثبوت اس کی طرف سے بھارت کو بلاجواز اور بے پناہ بحری امداد ہے جس سے اب انڈونیشیا کو بھی خطرہ محسوس ہونے لگا ہے۔

○

روس دراصل خلیج فارس، سری لنکا اور پھر ٹرانکو مالی تک اپنی بحری بالادستی کے منصوبے پر کارفرما ہے جہاں سے وہ پھر تائیوان، جنوبی کوریا اور جاپان کے لیے خاطر خواہ خطرات پیدا کر سکے اور یہ کام وہ بھارت کے ذریعے کروانے کا خواہش مند ہے اس لیے پاکستان اور بنگلہ دیش کو بھارت کی بحری بالادستی کے منصوبے سے آنکھیں بند کر کے بیٹھ رہنا نہیں چاہیے۔ دوسری طرف پنجاب کی سرحدوں کی صورت حال بھی بہت تشویش ناک ہے۔ جہاں بھارتی فوج کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے بھارت مشرقی پنجاب میں روز بروز زور پکڑتی ہوئی تحریک آزادی خالصتان کو کچلنے کے لیے یہاں فوجوں اور اسلحہ کے انبار لگا رہا ہے اور اس فوجی اجتماع سے پاکستان کا آنکھیں بند کر لینا خطرناک ثابت ہو گا۔

یاد رہے محترمہ بے نظیر بھٹو خواہ کیسے ہی تعلقات راجیو گاندھی سے پاکستان کے استوار کر لیں بھارتی بالادستی کے جنون پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑے گا خود مسٹر راجیو گاندھی اپنے اقتدار کو محفوظ خیال نہیں کرتے جس کے لیے وہ کوئی بھی "ڈائنا میٹک اقدام" کر سکتے ہیں۔

ہمارے ہاں بدقسمتی یہ ہے کہ نارمل امریکن شہری بھارت کو صرف نقشے کے حوالے سے پہچانتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ ۸ ملین لوگوں پر گذشتہ قریباً ۴۰ سال سے کشمیری براہمن ڈکیٹر شپ مسلط ہے ہمارا آج کا سیاسی تجزیہ نگار ۲۰ ملین آبادی کے ملک ساؤتھ افریقہ کی ظالمانہ ڈکیٹر شپ پر تنقید کرتے ہوئے بھارت کو نہ جانے کیوں نظر انداز کر دیتا ہے وہ ملک جو کروڑوں اچھوتوں کے لیے جہنم بن چکا ہے جس نے کشمیری، آسامی، سکھ بنگالی، تامل، میزو اور ناگا کو جو اپنی اپنی جگہ ایک الگ اور آزاد قوم ہیں زبردستی بھارت کے ساتھ جکڑ رکھا ہے۔ شاید لوگوں کو تاریخ کا شعور نہیں رہا اور وہ بھارت کا وہی چہرہ دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں جو وہ انہیں دکھانا چاہتا ہے۔

سوال...... اگر افغان مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو پاکستان اور امریکہ کے تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی۔؟

جواب ..... بہت سے سینٹرز اور کانگریس مین سنجیدگی سے سوچتے ہیں کہ دوستی برقرار رہنی چاہیئے کیونکہ پاکستان ہمارا قریبی دوست ہے اور ہم اس خطے میں اپنے دوست کو گنوانا نہیں چاہتے پھر یہ بات بھی ہے کہ آپ ہماری دوستی کو افغان مسئلے سے مشروط نہین کر سکتے امریکہ اور پاکستان کے ۱۹۴۷ء سے اچھے مراسم قائم ہیں تب تو افغان مسئلہ نہیں تھا

اس لیے ہماری یہ خواہش ہے کہ ہم صرف افغان مسئلے پر انحصار نہ کریں اور یہ دوستی مضبوط بنیادوں پر قائم رہے اس کے ساتھ ہی ہم پاکستان کی معاشی خوشحالی میں بھی اپنا کردار ادا کریں ہم ٹیکنالوجی، انجنیئرنگ، فوڈ پراسسنگ اور پرائیویٹ سیکٹر میں پاکستان کی بہت مدد کر سکتے ہیں۔ پاکستان میں بہت سا پھل ضائع ہو جاتا ہے جبکہ

ہمارے پاس اس سلسلے میں ایڈوانس ٹیکنالوجی موجود ہے انرجی ایگریکلچرل اور فوڈ پراسس میں ہم ایک دوسرے سے بہت تعاون کر سکتے ہیں پاکستان کے پاس افرادی قوت ہے محنتی لوگ موجود ہیں صرف ایگریکلچرل کو آرگنائز کرنے کی ضرورت ہے۔

پاکستان کے پاس معدنیات کا خزانہ ہے ٹیکنالوجی کے حصول سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے سورج کی وافر روشنی میسر ہے ہم "سولر انرجی" میں بہت آگے جا سکتے ہیں غرض تعاون کے متعدد مواقع موجود ہیں۔

دیکھیے صرف "ایڈ" (امداد) آپ کے مسائل کا حل نہیں ہے پرائیویٹ سیکٹر بہترین چینل ہے ہم صرف امداد پر آپ کا انحصار نہیں چاہتے ہم مضبوط دوستی اور تعاون پر یقین رکھتے ہیں میرے خیال سے صرف ڈیفنس کا شور کافی نہیں ہے ہمیں تعاون کے لیے نئی راہیں تلاش کرنا ہوں گی ہم پاکستان کو پولیس مین نہیں بزنس پارٹنر بنانا چاہتے ہیں آپ سعودی عرب کی مثال لے لیں۔

تائیوان سنگاپور کوریا مڈل ایسٹ میں ہمارا کردار دیکھ لیں ہمیں اب آگے سوچنا ہوگا یوں بھی اب امریکہ میں ری پبلکن حکومت ہے جو پاکستان دوستی کے لیے مشہور ہے مشرق کے ساتھ ہمارے تجارتی روابط کوئی نئی بات نہیں ہم دو سو سال سے بحیرہ ہند میں موجود ہیں ۱۷۸۳ء میں بحیرہ ہند میں زیادہ تجارت امریکن بحری جہازوں کے ذریعے ہی ہوتی تھی حالانکہ برٹش جہاز بھی یہاں موجود تھے لوگ سمجھتے ہیں امریکہ شاید یہاں نیا ملک ہے وہ تاریخ کو بھلا دیتے ہیں ۱۸۰۲ء میں بیروت میں امریکی سفیر موجود تھا۔

○

ڈاکٹر کیراکاف نے مجھے اپنی تصویر اتارنے کی اجازت نہیں دی۔ اس کی وجہ بھی آف دی ریکارڈ ہے۔ سینٹ آفس بلڈنگ کے باہر تک ہمیں رخصت کرنے آئے۔

امریکی دیگر یورپی اقوام کی نسبت مہمان نواز زیادہ ہیں اس کا احساس مجھے بعد میں بھی مختلف مراحل پر ہوا۔

واشنگٹن سے اسی روز میں واپس نیویارک آ گیا جہاں ورلڈ سکھ آرگنائزیشن نے بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کے مبینہ قاتل ستونت سنگھ اور کہر سنگھ کی پھانسی کے خلاف ایک مظاہرہ ترتیب دیا تھا۔ امریکہ میں یہ سکھوں کی سب سے زیادہ سرگرم عمل تنظیم ہے جو خالصتان کے حصول کے لیے بین الاقوامی سطح پر زبردست لابنگ کرتی ہے اس تنظیم کی طرف سے ورلڈ سکھ نیوز نامی ایک ہفت روزہ انگریزی اور گورمکھی زبان میں کیلیفورنیا سے گزشتہ چار پانچ سال سے باقاعدگی سے نکالا جارہا ہے۔

ورلڈ سکھ کے جگجیت سنگھ مانگٹ سے ملاقات ہوئی جو یہاں کے خاصے معروف کاروباری آدمی ہیں۔ لیکن اپنی قوم کی خدمت کے لیے ہمہ وقت سرگرم عمل بھی رہتے ہیں۔ یہاں سکھ رہنماؤں نے مجھے بھارتی پولیس کے تشدد کے ہاتھوں موت پانے والے سرب جیت سنگھ جوہر کی تصاویر بھی دکھائیں۔ یوں تو بھارتی سرکار کے اپنی اقلیتوں پر توڑے جانے والے مظالم کی بھیانک تصاویر آئے روز دنیا کو دیکھنے کے لیے مل جاتی ہیں لیکن براہمن کے بعض روپ تو اتنے بھیانک اور کریہہ ہیں کہ انسانیت انہیں دیکھ لے تو شرمسار ہوئے بغیر نہیں رہتی۔

سرب جیت جوہر ایک طالب علم تھا جس پر پولیس کو شک تھا کہ اس کے روابط خالصتان کے حامی سکھ گروپس سے ہیں لیکن ایسا کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں تھا جسے عدالت میں اس کے خلاف پیش کیا جا سکے۔ حسب روایت ایک روز بھارتی خفیہ پولیس کے اہلکاروں نے اسے کالج سے گھر واپس لوٹتے ہوئے اغوا کر لیا۔ اتفاق سے اس کے ایک ساتھی نے سرب جیت کو اغوا ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے جوہر کے گھر والوں کو اطلاع دے دی جنہوں نے جوہر کی بازیابی کی کوشش شروع کر دی۔

جوہر اپنے لواحقین کو تیسرے روز مل گیا لیکن زندہ نہیں۔ اس کی مسخ شدہ لاش

کھیتوں میں ملی۔ اس کے جسم کے ہر انچ کے فاصلے پر سوراخ موجود تھے یہ سوراخ اس کے بدن میں جلتی ہوئی لوہے کی سلاخوں سے کیئے گئے تھے ایک رشتہ دار نے جرائت سے کام لیتے ہوئے اس کی تصاویر اتارلیں اور انہیں بیرونی آزاد دنیا تک پہنچا دیا۔

ان تصاویر کو دیکھ کر بڑے بڑے شقی القلب بھی اپنا دل مسوس کر رہ جاتے ہیں لیکن اصل میں یہی بھارت کی اصلی تصویر ہے۔

○

مئی ۸۸ء میں روس کی کٹھ پتلی حکومت کے سربراہ نجیب اللہ نے بھارت کا دورہ کیا۔ ان دنوں ۱۶۔ مئی ۸۸ء کو سینٹر جیسی ہیلمز نے امریکی سینٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ میں یہاں آپ کی توجہ کچھ اور ضروری مسائل کی طرف دلاتا ہوں جو نجیب اللہ کے تین روزہ دورہ بھارت کے حوالے سے ذہن میں ابھرتے ہیں

بھارتیوں نے نجیب اللہ کو روسی افواج کے اخراج سے پیدا ہونے والے خلاء کو پر کرنے کے لیے "بحالی امن افواج" بھیجنے کی پیشکش کی ہے۔ بھارت اور روس کے فوجی تعلقات کے حوالے سے پہلی بات یہی ذہن میں آئی ہے کیا بھارتی افواج روسی افواج کی غیر موجودگی میں افغانستان میں روسی سٹریٹجی کو جاری رکھیں گی؟ کیا بھارتی افواج روسی پٹھو نجیب اللہ کی زیر کمان ہوں گی یا یواین او کی یا پھر مجاہدین اور افغان حکومت کے درمیان "بلفرزون" بنیں گی؟

کیا افغانستان میں بھارتی فوج اس لیے تو نہیں بھیجی جا رہی کہ پاکستان پر دو طرفہ فوجی دباؤ قائم کیا جائے؟ کیا بھارت نے ان سردیوں کے خاتمے پر جب برف کی وجہ سے قراقرم پاس ناقابل استعمال ہو جائے اور پاکستان کے لیے چینی مدد کے راستے بند ہوں پاکستان کے خلاف جنگ کرنے کا ارادہ تو نہیں کرلیا۔

کیا بھارت جو اپنی بیشتر سکھ یونٹیں افغانستان بھیجنے کے لیے پر تول رہا ہے یہ تو نہیں چاہتا کہ اس طرح سکھوں کی جدوجہد آزادی کو سبوتاژ کرے اور افغانستان میں جب سکھ افواج اور مسلمانوں میں سکھوں کے خلاف نفرت پیدا ہو اور وہ آپس میں لڑنے لگیں جس سے سکھوں کی جدوجہد آزادی کو زک پہنچے۔

جناب صدر! میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اس حساس خطے پر امریکہ کڑی نظر رکھے اور ہمارے مفادات یہاں مجروح نہ ہونے پائیں۔

سینٹر ہیلمز بھارتی بالادستی کے جنون کا مکمل ادراک رکھتے ہیں۔

امریکہ کی ۱۰۰ویں کانگریس کے پہلے سیشن میں ۲۱ مئی ۸۷ء کو انہوں نے بھارتی پنجاب میں اکالی دل حکومت توڑنے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

اس ایکشن کا مطلب آخر کیا ہے؟ ماہرین کا خیال ہے کہ مسٹر راجیو گاندھی نے بھارت میں ملک گیر سطح پر ایمرجنسی کے نفاذ اور دوسرے صوبوں کی حکومتوں میں اپنی مرضی کے مطابق جوڑ توڑ کا آغاز کیا ہے۔ اس امر کے شواہد موجود ہیں کہ اس اقدام کے ذریعے بھارت نے ہمسایہ ملک پاکستان کے خلاف جنگ کی طرف ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جیسا کہ میں نے پرسوں اپنی تقریر میں کہا تھا کہ بھارت چین سے بھی جنگ کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ جناب صدر! ہم اکثر کہتے ہیں کہ بھارت دینا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔

میں آپ سے کہتا ہوں اگر ہم آزادی کے بعد سے بھارتی حکومت کے کارناموں کا جائزہ لیں تو یہ دنیا کی سب سے بڑی ڈکٹیٹر شب ہے۔ مشرقی پنجاب کی حکومت کا خاتمہ اسی کی ایک مثال ہے۔

جناب صدر! جنوبی افریقہ میں نسلی تعصب کی باتیں ہم بہت بڑھ چڑھ کر کرتے ہیں اور اکثر اس کی مثال دی جاتی ہے لیکن آج تک کسی کو ایک لفظ بھارت کے ذات پات کے نظام کے خلاف کہنے کی توفیق نہیں ہوئی جہاں قریباً ۱۰۰ ملین لوگ ایک ایسے جہنم میں زندگی بسر کر رہے ہیں جیسا جہنم ہمیں ساؤتھ افریقہ میں دکھائی دیتا ہے"۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بھارت جو بہت بڑا اور بے شمار مسائل میں گھرا ایک ملک ہے اسے آخر ٹانگیں مزید پسارنے کی کیا ضرورت پیش آگئی جو اب بھارت کی حالیہ سری لنکا اور مالدیپ میں فوجی جارحیت سے نمایاں ہے اور اس کا پس منظر بھارت اور روس کے فوجی تعلقات کے پس منظر میں بخوبی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ دراصل روس کی جنگی منصوبہ بندیوں کہ حصہ ہے۔

ہاؤس فارن افیئر کمیٹی کے ولیم بروم فیلڈ نے گزشتہ ماہ اپنی رپورٹ میں یہ بات کہی تھی کہ ۱۹۸۰ء سے اب تک بھارت نے روس سے چار ملین ڈالر سے زائد کا اسلحہ خرید کیا ہے۔ ایک ایسا ملک جہاں فرد کی سالانہ آمدنی فی ۱۵۰ء ڈالر سالانہ ہو کے لیے زیادہ اسلحے کی خریداری اس کے جنگی جنون کی نشاندہی کو کافی ہے۔

آج صورت یہ ہے کہ بھارت کو اپنی جنگی قوت کے لیے ۸۰ فیصد انحصار روس پر کرنا پڑتا ہے۔

یہ معمولی واقعہ نہیں ہے کہ گزشتہ سال بھارتی دارالحکومت دہلی میں لینن کا بہت بڑا مجسمہ نصب کیا گیا ہے آج تک کسی امریکی لیڈر کی مورتی وہاں نہیں سجائی گئی۔ حالانکہ امریکہ بھارت کو سالانہ لاکھوں ڈالر کی امداد بھی دیتا ہے۔

انڈیا نے یو این او میں ہمیشہ روس کے حق میں ووٹ ڈالا ہے اور کبھی افغانستان میں روسی جارحیت پر تنقید نہیں کی۔ یہاں امریکہ میں شائع ہونے والی ایک اہم دفاعی رپورٹ میں یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ بھارتی پائلٹ روسی مگ طیاروں کو اڑاتے اور روسی فوجیوں کے درش بدوش مجاہدین افغانستان کے خلاف محاذ آرائی میں مصروف ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ امریکہ ہوش کے ناخن لے اور بھارت کی اصلیت کو سمجھنے کی کوشش کرے جلدی امریکہ جان لے گا کہ روس بھارت کے ذریعے اپنے ایشیائی بالادستی کے خواب کو پورا کرنا چاہتا ہے

○

واشنگٹن سے دریائے پوٹامک کی طرف جائیے تو ایک خوبصورت سٹیٹ **ورجینیا** نام کی آتی ہے جہاں ماؤنٹ ورنر پر امریکہ صدر جارج واشنگٹن کا گھر اور باغات واقع ہیں جنہیں اب ایک تاریخی مقام کا درجہ حاصل ہے۔

یہاں جنگل کی خاموشی میں پہاڑی گزرگاہ پر ایک خوبصورت شہر آباد ہے جہاں بلاشبہ امریکی متمول شخصیات کا قیام ہے پہاڑی بھول .بھلیوں میں واقع اس شہر کے ایک خوبصورت بنگلے میں سردار گنگا سنگھ ڈھلوں کے گھر کے باہر سکھوں کا ''نشان صاحب'' نصب ہے اور دن اور رات میں دو تین مرتبہ پولیس کی پیٹرول پارٹی اس کی خبر لینے کے لیے اس نشان صاحب کے سامنے ضرور رکتی ہے۔ خلاف توقع آپ کو اس کے گھر کا دروازہ کھلا ملے گا۔ علاوہ ازیں بھی وہ حفاظتی اقدامات کو اہمیت نہیں دیتا جو امریکہ میں اچھبنے کی بات ہے۔

''زندگی کا ایک لمحہ پہلے یا بعد میں کسی کو فالتو میسر نہیں آتا پھر یہ بات بھی ہے کہ میری مذہبی تعلیمات کے مطابق میرے مرنے جینے پر میرا نہیں بلکہ پرماتما اللہ کا اختیار ہے پھر میں اس کی فکر کیوں کروں''۔ وہ اپنے ملنے والوں سے عموماً یہ بات ضرور کہتا ہے۔

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ گنگا سنگھ ڈھلوں کی زندگی کو خطرہ لاحق نہیں تو وہ احمقوں کی جنت میں رہتا ہے آپ کو اکثر امریکی صحافی اس کے متعلق یہ رائے دیں گے گنگا سنگھ ڈھلوں کا تعلق بظاہر سکھوں کی کسی بڑی تنظیم سے نہیں

لیکن اس کے متعلق بھارت کی حکومت یقین رکھتی ہے کہ مشرقی پنجاب میں چلنے والی تحریک خالصتان کی نبض پر اس کی مضبوط گرفت موجود ہے اور پاکستان میں سکھوں کے لیے کسی بھی قسم کی سہولت حاصل کرنا اسی کا کام تھا سابق صدر مرحوم جنرل ضیاء الحق سے اس کے ذاتی مراسم ساری دنیا کے علم میں ہیں۔ مرحوم چودھری ظہور الٰہی سے اپنی دوستی پر اسے فخر ہے۔

○

گنگا سنگھ ڈھلوں کے گھر میں داخل ہوتے ہی جس ڈرائنگ روم میں آپ کو بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے وہاں گورونانک دیو کی ایک بڑی پینٹنگ کے ساتھ دربار صاحب امرتسر کی تصویر اور دوسرے کونے پر گوروگوبند سنگھ کی تصویر نظر آئے گی۔
کسی سکھ کے گھر میں آپ کو اپنے ظہور الٰہی مرحوم کی ایک بڑی تصویر دکھائی پڑے گی۔
کسی سکھ کے گھر میں آپ کو اپنے گورو کی تصویر کے ساتھ مسلمان سیاسی لیڈر کی تصویر نظر نہیں آئے گی۔
اس نے مجھے کہا میری دوستی چودھری کی زندگی سے نہیں ان کے اصولوں سے تھی اور میری موت کے بعد بھی اس طرح زندہ اور برقرار رہے گی مجھے اس پر فخر ہے گنگا سنگھ ڈھلوں ایک وضع دار اور روایت پرست انسان ہے سکھی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنا اس کی خواہش رہتی ہے جس کا اظہار اس کے گھر کے ایک کمرے میں بنے چھوٹے سے گوردوارے سے ہوتا ہے۔
اس کمرے میں روزانہ کیرتن ہوتا ہے۔ دربار صاحب ایک منقش چوکی پر سجا ہوا موجود ہے یہاں ایک خاصے کی چیز گورو نانک دیو کی وہ تصویر ہے جو ملکہ پکھراج کے ہاتھ سے بنی ہے یہ تصویر ملکہ پکھراج نے بطور خاص بنا کر گنگا سنگھ ڈھلوں کو پیش کی

تھی اس تصویر کو دیکھنے والا خود تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔

گورو نانک کی تصویر میں موجود تقدس یہاں اپنے مکمل پن کے ساتھ موجود ہے یہاں مجھ پر پہلی مرتبہ انکشاف ہوا کہ ملکہ پکھراج کلاسیکی گائیکہ ہی نہیں بلکہ مکمل آرٹسٹ ہیں اور ان کی مصوری کا منہ بولتا ثبوت گورو نانک دیو کی یہ شاندار پینٹنگز ہے۔

گنگا سنگھ ڈھلوں کی خاموش سفارت کاری کا اندازہ صرف اس بات سے لگا لیجئے کہ 88ء میں برطانیہ کے ہاؤس آف کامن میں اس کے مسئلے کو ٹیری ڈکس نے اٹھایا تو ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹیری ڈکس نے گنگا سنگھ کے برطانیہ میں داخلے پر پابندی کے خلاف برطانوی ہاؤس کے ممبران کو جھنجوڑا اور ان سے سوال کیا تھا کہ دہشت گردی بھارت کر رہا ہے یا سکھ کر رہے ہیں؟ اور یہ کہ آخر بزعم خویش جمہوریت کی دعویدار سپر طاقتیں تصویر کے صرف اسی پہلو کو دیکھنے پر بضد کیوں ہیں جو بھارت انہیں دکھانا چاہتا ہے۔

اس مباحثے نے گنگا سنگھ ڈھلوں کو ایک مرتبہ پھر بین الاقوامی اخبارات کی خبروں میں زندہ کر دیا۔

امریکی سینٹ میں ڈیموکریٹس اور ری پبلکن دونوں کے ساتھ اس کے تعلقات مثالی ہیں۔ اس نے اپنی حد تک امریکی اقتدار کے ایوان میں سکھوں کے مسئلے کو زندہ رکھا ہوا ہے پیٹر گالبرائتھ سے بھی میری ملاقات گنگا سنگھ ڈھلوں نے ہی کروائی تھی۔

پاکستان کی وزیر اعظم محترمہ بینظیر بھٹو پر لکھی کتاب ڈاٹر آف ایسٹ دختر مشرق کے حوالے سے پیٹر گالبرائتھ کا نام خاصا معروف ہے۔ پیٹر گالبرائتھ اپنے زمانے کے مانے ہوئے سفارت کار تھے اور اپنی سفارتی زندگی کا زیادہ عرصہ انہوں نے بھارت ہی میں گزارا بھارت نوازی کے لیے خاصے معروف رہے ہیں۔ ان کے صاحب زادے مسٹر پیٹر گالبرائتھ پر اپنے والد کی سیاسی تعلیمات کا اثر بہت گہرا ہے اور وہ ذہنی طور پر

اسی مکتب فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جو ان کے والد کا تھا۔

پیٹر گالبرنتھ محترمہ بینظیر کی شخصیت سے بہت متاثر ہیں انہیں محترمہ کے ساتھ رہ کر کام کرنے کا اور ان کی سیاسی سرگرمیوں کا قریب سے جائزہ لینے کا موقعہ بھی ملا ہے 88ء کے انتخابات میں بھی وہ پاکستان میں موجود تھے ان سے ہونے والی گفتگو پیش ہے۔

○

سوال..... مسٹر گالبرائتھ سب سے پہلے میں اپنے ملک میں ہونے والے حالیہ انتخابات پر آپ کی رائے جاننا چاہوں گا۔

جواب...... میں دوران الیکشن پاکستان میں موجود تھا اور وہاں مجھے انتخابات کو نہایت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ میرے خیال میں جنوب ایشیاء میں اتنے غیر جانبدارانہ اور منصفانہ انتخابات کی کوئی مثال دیکھنے کو نہیں ملتی ایک لمبے عرصے کے بعد پاکستانی قوم کو ایک بہترین موقعہ ملا تھا کہ وہ جمہوری روایات کو اپنے ہاں مضبوط بنا سکیں اور پاکستانیوں نے ثابت کر دکھایا کہ وہ جمہوریت کی اہل قوم ہیں بلاشبہ ان پر ایک عرصہ تک ڈکیٹیٹرشپ مسلط رہی لیکن وہاں جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہونے کی وجہ سے انہوں نے اس موقع پر عظیم روایات کا مظاہرہ کیا۔

جہاں تک جنرل ضیاء کی موت کے بعد انیٹرم گورنمنٹ کا معاملہ ہے تو کچھ خدشات بھی موجود تھے لیکن حکومت نے کسی ایک فریق کی حمایت کی بجائے انتخابات کو زیادہ سے زیادہ غیر جانبدار بنانے کی کوشش کی اور کسی سیاسی جماعت کو شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔

سوال ...... مسٹر گالبرائتھ آپ ہماری نئی وزیراعظم سے قریبی رابطہ رکھنے کی وجہ سے جانتے ہوں گے کہ وہ کم عمر اور حکومتی معاملات میں زیادہ تجربہ کار بھی نہیں ہیں

کیا آپ کے خیال میں اس خطے کی حساس نوعیت کے پیش نظروہ کاروبار حکومت بخوبی چلا سکیں گی۔؟

جواب..... اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس سے پہلے محترمہ بینظیر بھٹو حکومتی ایوانوں میں نہیں بیٹھیں لیکن ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے انہوں نے اپنا لوہا منوایا ہے اور سیاست کے ہر کڑے امتحان میں پاس ہو چکی ہیں

یہاں مغربی دنیا میں انہوں نے جو پریس کانفرنسیں کی ہیں وقتاً" فوقتاً" جو سیاسی بیانات ان کی طرف سے جاری ہوتے رہے ہیں انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ سیاست میں نو آموز ہیں میرے خیال سے ان کی پارٹی بجاطور پر ایک جمہوری پارٹی ہے انہوں نے آمریت کے خلاف ایک لمبی لڑائی لڑی ہے اور بہت سی مشکلات سے کندن ہو کر نکلی ہیں۔

ان حالات میں یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ مسائل پر قابو پالیں گی یوں بھی انہیں جمہوری طاقتوں کی ہمدردی حاصل ہے جہاں تک فوج کا تعلق ہے تو فوج کے سربراہ کی بھی یہی خواہش تھی کہ تمام قانونی تقاضے پورے ہوں انتخابات کروائے جائیں گو کہ یہ مشکل کام تھا لیکن فوج کی سرپرستی کی وجہ سے اور خصوصاً جنرل اسلم مرزا کی ذاتی دلچسپی اور جمہوریت دوستی کی وجہ سے یہ کارنامہ انجام پا گیا گویا آپ کی فوج بھی اب جمہوری قوتوں کی حمایت کر رہی ہے میرے خیال سے یہ بڑی اہم بات ہے۔

سوال..... آپ کے ہاں پریس میڈیا کی طرف سے ایک تاثر یہ بھی دیا جارہا ہے جیسے محترمہ بینظیر اور بھارت کی سابقہ وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کی شخصیات قریباً ایک جیسی ہیں اور انہیں مسز اندرا گاندھی سے تشبیہ دی جا رہی ہے

جواب .... میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا دونوں کے حالات کبھی ایک جیسے نہیں رہے اگر آپ جائزہ لیں تو مسز اندرا گاندھی کی ایک پوزیشن شروع ہی سے کانگریس میں اپنے باپ نہرو کی وجہ سے رہی ہے اور وزیر اعظم بننے سے پہلے بھی

انہیں سرکاری وزارت کے منصب پر فائز رہنے کا موقعہ ملا ہے پھر انہیں اتنی کڑی آزمائشوں سے بھی نہیں گزرنا پڑا کیونکہ کانگریس بھارت کی عموماً مقبول جماعت ہی رہی ہے۔

اس کے برعکس محترمہ بینظیر نے گیارہ سال کی طویل مسافت طے کی ہے اور بڑی کڑی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد ہی وہ یہاں تک پہنچی ہیں ان کی جدوجہد مسز گاندھی سے بالکل الگ طرح کی ہے اس لیے دونوں کا موزانہ غلط بات ہے۔

سوال۔ بھارت اور پاکستان دونوں میں نوجوان لیڈر شپ کی موجودگی میں آپ پاک بھارت تعلقات کا مستقبل میں کیا نقشہ دیکھ رہے ہیں

جواب..... بہت اچھا دونوں ممالک میں جمہوری حکومتیں ہیں نوجوان اور پر عزم قیادتیں موجود ہیں دونوں اچھے تعلقات کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔

یوں تو پاکستان اور بھارت دونوں حکومتوں کی طرف سے بیانات بھی دیئے جاتے ہیں کہ انہیں اچھے ہمسایوں کی طرح رہنا چاہیئے لیکن ماضی میں صورت حال کچھ اچھی نظر نہیں آئی میرے خیال سے دونوں ممالک کی تاریخ میں ایسے دوستانہ مراسم قائم کرنے کا اس سے بہترین موقعہ پھر کبھی نہیں آئے گا۔ اور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ماضی کے مقابلے میں دونوں ممالک کے درمیان اچھے تعلقات قائم ہوں گے۔(ابھی سارک کانفرنس نہیں ہوئی تھی) جلد ہی پاکستان میں سارک کانفرنس ہونے والی ہے جس پر مسٹر راجیو گاندھی کی طرف سے پاکستان کے دورے کا اعلان بھی ہو چکا ہے یہ بڑی خوش آئند بات ہے.اور آپ دیکھیں گے کہ اس ملاقات کے بڑے دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔

سوال ..... پاکستان میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ امریکہ نے کسی حد تک پاکستانی انتخابات پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی ہے یوں بھی ڈیموکریٹس سے متعلق ہمارے ہاں ایک خاص رائے بھی موجود ہے؟

جواب ..... ڈیموکریٹس نے آپ کے انتخابات میں دلچسپی ضروز لی ہے۔ لیکن ہماری دلچسپی صرف اس حد تک تھی کہ پاکستان میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات ہو جائیں اور بس۔ آپ اسے نیک خواہش کہہ سکتے ہیں۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ ڈیموکریٹس نے کبھی عملی مداخلت کی ہے امریکہ کی کسی سیاسی جماعت نے کسی ملک کے معاملات میں عملی مداخلت نہیں کی اگر کوئی ایسا سوچتا ہے تو غلط ہے ہماری دلچسپی پاکستان کی سیاسی جماعتوں میں نہیں رہی ہماری دلچسپی پاکستان کی موجودہ قیادت ہے جس سے ہماری بہت سے امیدیں وابستہ ہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ مسز بے نظیر کی حکومت پاکستان اور امریکہ کے درمیان تعلقات کو مزید مضبوط اور مستحکم بنائے گی؟

سوال.... روس کے افغانستان سے نکل جانے کے بعد پاکستان اور امریکہ کی دوستی کی نوعیت کیا ہوگی۔

جواب..... میرے خیال سے ہماری دوستی میں دراڑ پڑے گی وہ غلط بات ہے پاکستان میں ایک جمہوری حکومت موجود ہے اور کسی بھی جمہوری حکومت سے معاملات طے کرنا نسبتاً آسان کام ہے ڈکٹیٹر شب ہمارے لیے بہت پرابلم بنی ہوئی تھی۔ اب ایسی بات نہیں ہے ڈیموکریٹس جمہوری حکومتوں سے معاملات کو زیادہ پسند کرتے ہیں ایک جمہوری حکومت کی موجودگی میں میرے خیال سے ہمیں اپنی دوستی کو مضبوط کرنے اور نئے معاہدے کرنے کے اچھے مواقع میسر آئیں گے۔

سوال ..... مسٹر **گلبرائتھ** آپ نے دونوں ممالک کی لیڈر شب سے خاصی امیدیں وابستہ کی ہیں۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر ہمیشہ ایک نزاعی مسئلہ رہا ہے کیا آپ کے خیال میں ہمیں اس نوجوان قیادت سے امید کرنا چاہیے کہ وہ اس مسئلے کا کوئی مستقل حل تلاش کرلیں گے۔

جواب..... میں اس پر کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

○

اگلے روز میں نیویارک پہنچ گیا جہاں مجھے ان دو سکھ نوجوان سے انٹرویو کرنا تھا جو بھارتی حکومت کو جنرل ودیا کے قتل کے سلسلے میں مطلوب ہیں۔ اور یہ دونوں جعلی پاسپورٹوں کے ذریعے جان بچانے کے لیے کنیڈا کے راستے امریکہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

ان کی گرفتاری بھی بھارتی حکومت کے کہنے پر عمل میں لائی گئی اور اب بھارتی حکومت نے ان پر مقدمہ چلانے کے لیے امریکی حکومت سے ان کی ڈیمانڈ کی ہے جبکہ ورلڈ سکھ آرگنائزیشن نے ان کو سیاسی پناہ دلانے اور بھارتی حکومت کی دسترس سے محفوظ کرنے کے لیے امریکہ کی اعلیٰ عدالت میں مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔

رنجیت سنگھ رانا اور سکھمندر سنگھ سندھو نیویارک جیل میں نظر بند ہیں۔ یہ دونوں نوجوان بھارتی پنجاب کے کھاتے پیتے اور ممتاز معاشرتی مقام کے حامل گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ بھارتی پولیس نے انہیں مشتبہ جان کر پہلے گرفتار کیا اور مشرقی پنجاب کے مختلف عقوبت خانوں میں ان کے ساتھ ہر بے جا تشدد روا رکھا۔ جس کے بعد انہیں بے گناہ جان کر چھوڑ دیا بعد میں دونوں کو ایک ایس ایس پی کے قتل کی سازش میں ملوث کر کے گرفتار کرنا چاہا۔

دونوں اپنی جان بچانے کے لیے امریکہ بھاگ آئے جہاں انہیں گرفتار کر لیا گیا امریکہ آنے کے بعد ان کے علم میں یہ بات بھی آئی کہ بھارت حکومت نے ان پر اور بھی بہت سے جرائم کی ذمہ داری عائد کر دی ہے۔ اور وہ بقول بھارت سرکار بھارتی جرنیل ودیا کے قتل میں بھی ملوث ہیں ۔ اب بھارتی حکومت نے انہیں مقدمات چلانے کے لیے امریکی حکومت سے طلب کیا ہے جب کہ دونوں نے اس کے برعکس امریکی حکومت سے اپنی جان کے تحفظ کے لیے "ریفیوجی حیثیت" کا مطالبہ کر رکھا

ہے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ بھارت سرکار نے سرکاری طور پر چونکہ دونوں کو بہت بڑے دہشت گرد قرار دے رکھا ہے۔ اس لیے امریکی حکومت ان کی قسمت کا کوئی فیصلہ ہونے تک انہیں کڑی نگرانی میں رکھنے پر مجبور ہے اور دونوں نوجوان ناکردہ گناہ کی پاداش میں جیل کاٹ رہے ہیں ان کا کیس لڑنے کے لیے امریکہ میں سکھوں کی سب سے بڑی تنظیم ورلڈ سکھ آرگنائزیشن نے نیویارک میں. تین چوٹی کے وکلا کی خدمات حاصل رکھی ہیں

رانا اور.سندھو کو بھارتی حکومت کی مہربانی سے کچھ زیادہ ہی شہرت مل گئی ہے جبکہ ایسے بے شمار کیس لندن کینیڈا امریکہ اور جرمنی کی عدالتوں میں پہلے ہی سے چل رہے ہیں۔ ان نوجوانوں سے ملاقات جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے خاندان کے لوگ مسلسل ذہنی و جسمانی عذاب میں مبتلا ہیں۔ ان کی سرکاری نوکریاں چھین لی گئی ہیں۔

ان کے والدین اور رشتہ داروں کو بے گھر کرکے مختلف لبانوں سے وقتاً فوقتاً جیلوں اور تفتیشی مراکز میں لے جایا جاتا ہے اور اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ وہ آل انڈیا سکھ سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرگرم کارکن اور امرت دھاری سکھ رہے ہیں دونوں کا کیس چونکہ زیر سماعت ہے اس لیے بہت سی باتیں ابھی آن دی ریکارڈ نہیں آسکیں لیکن جلد وہ وقت آئے گا جب دنیا بھارتی حکومت کی اھنسا کا ایک اور بھیانک روپ بھی دیکھ سکے گی۔

○

شام ڈھلے میں نیویارک میں دنیا کے معروف ترین ریڈیو سٹی ہال پہنچ چکا تھا۔ جو ۵۰

ویں شاہراہ پر واقع ہے ریڈیو سٹی ہال کو دنیا کے سب سے بڑے اور تصاویر سے مزین تھیٹر کی حیثیت حاصل ہے اس میں ۶۲۰۰ تماشائیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے اور اس کی دیواروں پر دنیا بھر کی مصوری کے شاہکار سجے دکھائی پڑتے ہیں۔

ہال کے اندر جیسے جیسے انسانی نگاہ دیواروں پر دوڑتی ہے انسان مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے اس ہال میں دنیا کا مشہور و معروف ڈانسنگ شو" دی راکٹس" ہوتا ہے یہ شو دیکھنے کے لیے دنیا بھر سے آرٹ اور موسیقی کے شائقین نیویارک آتے ہیں

یوں تو نیویارک کی بیشتر عمارتیں دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں اور ایسی تمام عمارتوں کا تذکرہ بھی شاید ممکن نہ ہو لیکن ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ ' روک فیلر سنٹر پلازہ کے سامنے ۱۸ فٹ بلند پیتل کا مجسمہ جس پر سونے کا پانی چڑھا ہے آزادی کا مجسمہ یو این او کے دفاتر ۵۷ ویں شاہرہ کے ڈیپارٹمنٹل سٹورز دریائے ہڈسن کے کنارے سے فلک بوس عمارتوں کے مناظر ٹائم سکوئر کی مشہور ۴۲ ویں شاہراہ' راک فیلر سنٹر چینلز گارڈن' سنٹرل پارک اور اس میں موجود جھیل اور سڑک کنارے بھاگتی بگھیاں سنٹرل پارک کے نزدیک دنیا کے مہنگے ترین ہوٹل ' ٹرینیٹی چرچ'سینٹ پیٹرک کھیڈرل جارج واشنگٹن برج کوئینز برج' اور بروک لین اور سٹاٹن کو ملانے والا دنیا کا طویل ترین پل یانکیز سٹیڈیم' نیویارک کے دونوں ائرپورٹ میونسپل سٹیڈیم' اس کے ساتھ ساتھ ٹائم سکوئر پھر چائنا ٹاون اور درجنوں ایسی ہی عمارتیں بلاشبہ دنیا کا عجوبہ مانی جاتی ہیں۔ اور ان میں سے کوئی بھی ایسی عمارت پارک یا سٹیڈیم میوزیم نہیں جہاں ایک مرتبہ جانے کے بعد آپ کم از کم آدھا دن یہاں نہ گزاردیں۔

وقت کی قلت نے مجھے بھی ان مقامات کا تفصیلی جازہ لنے کی مہلت کبھی نہیں دی

نیویارک میں یوں تو بہت سے چونکا دینے والے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن یہاں کے آوارہ اور بگڑے ہوئے لٹیروں کے بعد دوسری اہم شے یہاں کے فقیر ہیں امریکہ میں بھیک مانگنا اب کوئی ایسی معیوب بات نہیں جس کا نظارہ میں نے مختلف شہروں میں کیا ہے نیویارک 'واشنگٹن پنسلوینیا' کیلے فورنیا' نواڈا 'سان فرانس کو لاس اینجلز' فلوریڈا غرض جہاں بھی جس بڑے یا قابل ذکر شہر میں آپ کو جانے کا اتفاق ہوگا وہاں مصروف شاہراؤں عوامی آمدورفت کے راستوں تفریح گاہوں وغیرہ کے کسی نہ کسی کونے میں کوئی نہ کوئی ماڈرن بھکاری آپ کی توجہ اپنی طرف ضرور مبذول کرے گا۔

ان کے مانگنے کا انداز بھی ایسا دلچسپ اور متوجہ کرنے والا ہے کہ آپ رکے بغیر آگے نہیں جائیں گے۔

ہمارے ہاں کے فقیروں کی طرح امریکی فقیر آپ کی جان کو نہیں آجاتے بلکہ ان کا مانگنا بھی بے نیازی کا انداز لیے ہوئے ہے۔ زبانی بھیک مانگنے والے زیادہ تر نیویارک ہی میں ملتے ہیں۔ جو ٹریفک سگنل پر آپ کی گاڑی کے رکتے ہی آپ کو پہچان کر ڈبہ بجاتے آپ کے نزدیک آجائیں گے اگر ان کے خیال میں آپ مسلمان ہیں تو مانگنے والا خود کو ستم رسیدہ مسلمان کے روپ میں پیش کر کے اپنا کشکول سامنے کردے گا بصورت دیگر عام ڈائیلاگ ہی چلیں گئے

دوسری اور زائد قسم ان فقیروں کی ہے جن کے مطالبات ان کے سامنے لکھے رکھے ہیں۔ یا پھر انھوں نے بڑے بڑے کتبے لکھ کر اپنے گلے کا ہار بنا رکھے ہیں۔ جن پر بھیک مانگنے کی وجوہات درج ہوتی ہیں۔ ان میں بعض وجوہات تو خاصی جارحانہ ہیں مثلاً ایک صاحب اس لیے بھیک مانگنا چاہتے ہیں کہ ان کے پاس کمرے کا کرایہ نہیں ہے ہٹے کٹے ہیں چاہیں تو محنت مزدوری کر کے کمالیں لیکن بھیک مانگنا بہتر خیال کرتے ہیں۔

سگریٹ نوشی کرتی ہوئی ایک نوجوان فقیرنی بیئر کے خالی ڈبے کا کاسہ گدائی بنا کر سامنے

رکھے بیٹھی ہے جس کے پاس کھانے کے لیے پیسے نہیں۔

کوئی گیس کا بل ادا نہیں کر سکتا۔ تو کسی کا بڑا کنبہ ہونے کے سبب تھوڑے ویلفیئر میں گزارا ممکن نہیں

آپ اگر انہیں بھیک دیتے ہیں تو ان پر کوئی احسان نہیں کرتے۔ ایسا بے نیاز کہ بھیک وصول کرنے کے بعد شکریہ ادا کرنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کرتے

بھیک مانگنے کے ایسے ایسے طریقے آپ کو دکھائی دیتے ہیں کہ پاکستانی فقیر تو ان کے سامنے دم بھرتے دکھائی دیں گے۔

میں کلاڈلفیا سے سیکرامنٹو جا رہا تھا اور لاس اینجلس سے فلائیٹ تبدیل کرنی تھی ٹرانزرٹ لاؤنج میں بیٹھا اگلی فلائیٹ کا منتظر تھا کہ ایک نوعمر ینگر و ڈبہ بجاتا وہاں آگیا۔ منہ سی کمبخت کبھی کچھ نہیں کہیں گے۔

اس نے ایک ٹوپی اوڑھ رکھی تھی جس پر لکھا تھا منشیات سے جنگ۔ میں نے بھی حاتم کی خبر پا لات ماری اور ایک (امریکی چونی) اس کے ڈبے میں ڈال کر اپنی انا کو یہ کہہ کر تسکین دے لی کہ ہم امریکہ سے بھیک نہیں مانگتے۔ امریکہ کو بھیک دیتے بھی ہیں۔

اس طرح ایک مرتبہ سان فرانسسکو کے ”بے ایریا“ میں جب میں نے ایک خوبرو فقیرنی کی تصویر اتاری تو اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”ڈالر فرسٹ -----“

اس زہرہ گداز نے کہ جس کی جوانی مختصر سی چولی سے پھوٹ پڑتی تھی مجھے کہا۔

”او۔ کے“

میں نے سوچا سودا مہنگا نہیں اور پھر اس ہاتھ دے اور اسی ہاتھ لے کے اصول کے تحت میں نے ڈالر دیا اور اس نے تصویر اتروالی۔

ایک روز اسی طرح فلاڈلفیا میں مسز قریشی کے گھر جب دستک کی آواز پر میں نے

دروازے کے سوراخ سے باہر جھانکا تو نازک اندام گوری کو اپنا منتظر پایا۔!

یااللہ خیر!

دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو اس کافر ادا نے گردن کو ایک خاص انداز سے جھٹکا کر ایک ڈالر کی درخواست کر دی۔

"لیکن کیوں ؟

"میرے پاس سگریٹ نوشی کے لئے پیسے نہیں ہیں"—————— اس نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

"خدا کا شکر کرو تم پاکستان میں بھیک نہیں مانگ رہی ورنہ——————" میں نے اسے کچھ کہنا چاہا۔

وہ ہنس دی۔

شاید میری بات اسے سمجھ نہیں آئی تھی یا شاید سمجھ آگئی تھی

○

مجھے اگلے روز فلاڈلفیا جانا تھا فلاڈلفیا کا فاصلہ یوں تو نیو یارک سے بمشکل سو میل رہا ہوگا درمیان میں نیو جرسی اور اٹلانٹک سٹی ہی آتے ہیں۔ رات کا وقت تھا ایک پاکستانی بھائی سے مشاورت کی کہ کون سا ذریعہ سفر اختیار کیا جائے اس نے فوراً ہی فیصلہ دے دیا کہ پرائیویٹ کار لے لو زیادہ سے زیادہ سو یا ڈیڑھ سو ڈالر تک خرچ آئے گا سفر بھی محفوظ رہے گا ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھانے سے بھی بچ جاؤ گے انجوائے کرتے جانا سفر کا بھی مزہ آجائے گا۔

میں نے اس جہاندیدہ شخص کی رائے کو صائب جانا اور زندگی کی سب سے بڑی غلطی کرتے ہوئے ٹھک سے ائرپورٹ کے باہر کھڑی ایک پرائیویٹ کار میں سوار ہو گیا کار ڈرائیور ویسٹ انڈیز کا رہنے والا اور کرکٹ کا عاشق تھا کمبخت تمام راستے عمران خان، ظہیر عباس، میاں داد کے گن گاتا آیا راستے میں جگہ جگہ کار روک کر سڑک کے کنارے قابل دید مقامات کی نشاندہی بھی کی اسلام پر خاصی عالمانہ گفتگو بھی کرتا آیا میں اس کی معلومات اور اسلام دوستی کا فلاڈلفیا پہنچنے تک خاصا مداح بن چکا تھا امریکہ میں پہنچ کر اچھا بھلا آدمی امریکی جا بننے کی کوشش کرتا ہے میں بھی اپنے ان پیاروں کو جن کے ہاں جا رہا تھا امریکی سٹائل میں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ جو مجھے خاصا مہنگا پڑا۔

میری مداحی کا سارا بھرم ٹوٹ گیا جب اس ظالم نے مجھے مطلوبہ گھر کے سامنے پہنچ کر بل سے آگاہ کیا یہ اتنا ہی تھا جتنا پاکستان سے لندن تک جہاز کا کرایہ بنتا تھا۔

مجھ تہی دست کے پاس تھا ہی کیا جو اس گرگ جہاندیدہ کو نذر کرتا۔ اس نے میرے چہرے کے تاثرات سے میری مالی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے مجھے یہ دھمکی بھی

دے دی کہ اسے چونکہ یہاں پارکنگ میسر نہیں آرہی اس لیے کرایہ بھی ٹیکسی کے اندر ہی ادا کرنا ہو گا اور وہ ایک لمحے کے لیے بریک لگائے گا جب مجھے اپنے بیگ سمیت اتر جانا چاہیے خیریت گزری کے میزبان باہر موجود تھے۔ جنہوں نے میری مالی معاونت کی اور میں اپنے ٹھکانے تک پہنچا۔

○

مہربان ڈرائیور نے میری مالی اور نفسیاتی حالت ایسی بگاڑ دی تھی کہ اپنے میزبان محمود قریشی صاحب کے گھر کی سیڑھیاں چڑھتے میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ دیر تک اس حادثہ جانکاہ سے سنبھل نہ پایا میں بڑی مہذب ڈاکہ زنی کا شکار ہوا تھا۔ یہاں کے قوانین کے مطابق جن کا علم مجھے نہیں تھا کہ کسی اجنبی کو کرائے سے آگاہ کرنا احسن خیال کیا جاتا ہے۔ اس ظالم نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔

میرے میزبان فرشتہ صفت لوگ تھے۔ انہوں نے امریکہ جیسے بے مہر ملک میں رہنے کے باجود اپنی اصلیت کو ابھی تک نہیں بھلایا تھا ان کے ہاں وہی لاہور والی گرمجوشی' محبت اور مہمان نوازی موجود تھی۔ محمود قریشی اور مسز قریشی فلاڈلفیا میں بسنے والے مسلمانوں کے نزدیک دو قابل احترام شخصیتیں ہیں۔ مسلمانوں نے یہاں جو واحد آباد کی ہے اس میں محمود قریشی کا خاصا ہاتھ رہا ہے۔ یہ مسجد مسلمانوں نے ایک پرانی ہال نما عمارت خرید کر آباد کی ہے جو یہاں کے مسلمانوں کا واقعی اس لامذہب معاشرے میں ایک اہم کارنامہ ہے۔ مسجد کی اندرونی مرمت اور مطوبہ اشیاء کی فراہمی میں محمود قریشی کا حصہ نمایاں ہے۔

دونوں میاں بیوی کی تحریک پر مقامی مسلمان آبادی کے لوگ جمعہ یہاں پڑھتے ہیں۔ رمضان میں بھی کچھ رونق رہتی ہے اور وقتاً" فوقتاً" کسی نہ کسی تقریب کے حوالے سے یہاں کوئی نہ کوئی اجتماع بھی ہوتا رہتا ہے۔

غیر ممالک میں بس جانے والے کچھ بزعم خویش مہذب پاکستانیوں میں ایک

قباحت اکثر دیکھنے کو ملتی ہے کہ متعلقہ ملک کی شہریت حاصل کرتے ہی یہ لوگ سب سے پہلے مادر وطن کے خلاف ہذیان بکنے لگتے ہیں جوان کے "مہذب" ہونے کی بظاہر نشانی ہوتی ہے۔

میرے مشاہدے میں ایسی بہت دل دکھانے والی باتیں غیر ممالک میں آتی رہتی ہیں یہاں بھی ایک ایسے ہی صاحب سے پالا پڑا جنہیں پاکستان کے نظام ٹریفک' فضائی آلودگی اور بہت سے دیگر شکایتیں تھیں۔ ایسے لوگ اپنی معلومات کا رعب گانٹھنے کے لیے اپنی طرف سے بہت سی من گھڑت باتیں بھی پاکستان سے منسوب کر دیتے ہیں۔
جو صاحب یہاں بڑھ چڑھ کر پاکستانی عوام کی غیر اسلامی حرکات کا رونا رو رہے تھے ان کے متعلق یہ بات میرے علم میں آئی کہ اگلے ہی روز انہوں نے اپنی صاحب زادی کی سالگرہ ایک مقامی ہوٹل میں کی جہاں موجود بیشتر ڈشوں میں مکروہ گوشت استعمال ہوا تھا یعنی "جھٹکے" والا گوشت۔

اس ملک میں ایسے ماڈرن مسلمان بدقسمتی سے حلال حرام کی تمیز کیے بغیر کھاتے پیتے ہیں اور اب تو یہ ایک فیشن سا بن گیا ہے۔ مسٹر محمود اور مسز قریشی نے اس قباحت کے خلاف باقاعدہ مہم چلائی ہے اور مقامی مسلمانوں کو اسلامی آداب سے روشناس کروانے کے لیے انگریزی زبان میں بہت سا لٹریچر پاکستان' لندن اور عرب ممالک سے منگوا کر تقسیم کر رہے ہیں۔ ایک اور قابل ذکر خدمت ان دونوں کی یہ ہے کہ مسلمان بچوں کے والدین کو بچوں کو ناظرہ قرآن پاک پڑھانے کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔

اس سلسلے میں حال ہی میں انہوں نے قرآن سیکھنے کے ابتدائی قاعدے اور سیپارے منگوا کر تقسیم بھی کیے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہاں بیشتر مسلمانوں کے گھروں میں بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے یسرن القرآن بھی موجود نہیں تھے اب یہ کارنامہ دونوں میاں بیوی کے ذریعے انجام پا رہا ہے اور اسلامی اخلاق اور عبادات پر

بھی وہ بہت سالٹریچر منگوا کر یہاں تقسیم کر رہے ہیں۔

دونوں اپنے طور پر ہر وقت اس امر کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ مسلمانوں کو جس طرح بھی ممکن ہو ایک جگہ اکٹھے ہو کر اپنے مسائل سمجھنے اور ایک دوسرے کی خدمت کرنے کا موقعہ ملے۔ مقامی مسجد میں اکثر تقاریب کا محرک ان ہی کی ذات ہوتی ہے مسز انجم قریشی نے مقامی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

ہمارا سب سے بڑا مسئلہ تو یہی ہے کہ بدقسمتی سے بہت سے مسلمان اسلام کی ابتدائی تعلیمات سے بھی نابلد ہیں اور وہ مغربی سوسائٹی کے اتنے دلدادہ ہو گئے ہیں کہ ان لوگوں کی طرح رہنا سہنا اور کھانا پینا چاہتے ہیں۔

ان لوگوں نے اپنی ابتدائی شناخت یعنی مسلمان ہونے کو بھی کبھی درخور اعتنا نہیں جانا ہماری اولین کوشش تو یہی ہے کہ والدین کو اس بات کا قائل کریں کہ وہ خود اسلامی روایات و اقدار کی پابندی کریں اور کوشش کریں کہ ان کے بچے بھی مسلمانوں کے بچے نظر آئیں۔

ہم قرآن سوسائٹی کے ذریعے بچوں اور والدین کو قرآن پاک پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں اور ان کے لیے انہیں تمام ممکنہ سہولیات بھی مہیا کرتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر مسلمان بچیوں کی طرف سے پریشان ہوں۔

مقامی قباحتوں کا رنگ ہمارے بچوں پر بہت چڑھ رہا ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ان کے والدین نے اسلامی تعلیمات پر کبھی زور نہیں دیا نہ اس کا کوئی عملی نمونہ پیش کیا۔

مسز قریشی نے صحیح بات کی تھی جس کا عملی تجربہ مجھے اگلے ہی روز ہو گیا۔

○

نومبر کی آخری جمعرات کو یہ لوگ "تھنکس گیوونگ" مناتے ہیں۔ جس سے کرسمس کی تقریبات کا باقاعدہ آغاز ہو جاتا ہے۔ اس تقریب کو جس روز یہ دن منایا جا

رہا تھا میں ایک مسلم گھرانے میں مدعو تھا۔ جن کے انگریز ہمسایہ دوستوں نے ایک "ٹرکی" ان کے ہاں بھیجی تھی جسے وہ لوگ مزے لے لے کر کھا رہے تھے۔

جب میں نے ان کی توجہ اس جانب مبذول کروائی کہ یہ "ٹرکی" ذبح ہوئے بغیر پکی ہے تو انہوں نے فرمایا کہ ہم ایسی باتوں کو اہمیت نہیں دیتے۔

مغربی معاشرے نے دولت یا علم کے حصول کے لیے تارک وطن ہونے والوں کو جہاں بہت کچھ دیا ہے وہاں بہت سی قباحتوں سے بھی نوازا ہے ان لوگوں نے دنیا تو خوب کمائی ہے لیکن بے شمار روحانی مسائل بھی ان کا مقدر بن چکے ہیں۔

ایک ایسے گھرانے کی مثال حاضر ہے جہاں بیگم صاحبہ نے محض اس بات پر پولیس کو طلب کر لیا تھا کہ ان کے مجازی خدا نے انہیں گھر سے باہر رہنے پر ڈانٹ دیا تھا۔ ایک اور جگہ ایک صاحب زادی نے اپنے والد صاحب پر پولیس طلب کر لی تھی کہ وہ اس کے کمرے میں بغیر اجازت گھسے اور مخرب اخلاق فلم دیکھنے پر غصے میں آکر نہ صرف اس کا وی سی آر توڑ دیا بلکہ اس کو ڈانٹ ڈپٹ بھی کی۔

دنوں گھرانے پاکستان میں شادی شدہ تھے اور دس پندرہ سال پہلے ہی امریکہ میں آباد ہوئے تھے۔ وہ اتنے معزز لوگ ہیں کہ پاکستان میں کوئی ان کی طرف سے ایسی حرکت کی توقع ہی نہیں کر سکتا کیونکہ یہاں بڑے مذہبی لوگ سمجھے جاتے ہیں۔

یہ ہے اس معاشرے کی بھیانک تصویر کا معمولی سا عکس جہاں جانے کی دھن ہمارے نوجوانوں میں جنون کی طرح پھیل رہی ہے۔ جس ملک کی صاف شفاف سڑکوں' اعلیٰ انسانی اقدار' صفائی کے بہترین نظام کی تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے نہیں تھکتے۔ اس ملک نے انہیں ذہنی مریض بنا کر رکھ دیا ہے بغیر اجازت وہ اپنے بچوں کے کمروں میں نہیں جھانک سکتے۔ انہیں کسی بری حرکت سے ڈانٹ ڈپٹ نہیں کر سکتے۔

ان لوگوں کا المیہ یہ ہے کہ یہ پاکستان میں پیدا ہوئے' پلے بڑھے اور دنیا کمانے امریکہ آئے انہوں نے اپنی دانست میں امریکہ کا انتخاب صرف اپنے معاشی مسائل

کے حل کے لئے کیا تھا۔

لیکن------!

وہ نہ جان سکے کہ یہاں فکر معاش سے یونہی نجات نہیں مل جاتی۔

روحانی کرب کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

کاش میں آپ کو بتا سکتا کہ جب بیٹیاں جوان ہو جائیں تو ان کے عیوب کو ماں باپ کس طرح انکھیں بند کر کے جھیل جاتے ہیں۔

اپنے بچوں کے ایسے ایسے نخرے بادل نخواستہ برداشت کرنے پڑتے ہیں جن کا تصور ہی عام حالت میں محال ہے۔

ممکن ہے آپ نے بھی کسی ایسے پاکستانی کو دیکھا ہو جو اپنی بیٹی کو جوان ہونے سے پہلے بیاہنے کے لیے پاکستان لے آیا ہو------!

بس یہی ایک کمزوری ہے جوان لوگوں کو بالاخر اپنی زمین سے ٹوٹا رشتہ جوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

○

امریکہ میں زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہا جس میں سائنسی بنیادوں پر ترقی نہ کی گئی ہو۔ سائنسی ترقی اور مادی دولت کے بل بوتے پر اس کی معاشرتی زندگی بظاہر بڑی روشن اور دلفریب نظر آتی ہے تاہم اس میں وہ تاریک گوشے بھی موجود ہیں جن پر روشنی ڈالی جائے تو وہ اپنی تمام تر کراہت انگیز شکل کے ساتھ نظروں کے سامنے آجاتے ہیں سائنسی اور مادی ترقی کے سب سے بڑے دعوے دار امریکی معاشرے کا ایک مکروہ پہلو وہاں بچوں یا نابالغوں میں عصمت فروشی کا بڑھتا ہوا رجحان ہے۔

امریکہ میں جن بچوں کو قحبہ خانوں کی زینت بنایا جاتا ہے انہیں مڈ ویسٹرن شہروں

سے لایا جاتا ہے۔ ہر سال ایسے بچوں کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ ہوتی ہے۔ جنہیں اپنی بقاء کی خاطر اس قبیح فعل کو اپنانا پڑتا ہے۔ گلیاں ۔ قحبہ خانے۔ بس سٹاپ ان بچوں کا مقدر بن چکے ہیں۔ امریکہ میں اس طرح کے بچوں کو منشیات' لالچ اور مار پیٹ کے ذریعے اس گھناؤنے کاروبار میں گھسیٹا جاتا ہے۔ یہ بچے عملی طور پر غلاموں کی زندگی بسر کرتے ہیں کیونکہ وہ جس گروہ کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کے کرتا دھرتا انہیں اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔

دنیا کے ابتدائی ترقی یافتہ ملک امریکہ کا شہر ''نیویارک'' اُن مجبور بچوں کا سب سے بڑا مسکن ہے۔ معروف ''ٹائمز سکوائر'' میں پندرہ بلاکوں پر مشتمل ''نیسوٹاسٹرپ'' وہ جگہ ہے جہاں بچے دنیا کے اس قدیم دھندے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ گھر سے بھاگے یا بھگائے گئے بچوں کا یہی مسکن ہے ۔ جہاں سے وہ لوگ ان قحبہ خانوں یا پھر فحش تصاویر کے کاروبار کے لیے بھرتی کرتے ہیں۔ جن کا اول و آخر کام یہی ہے کہ یہ مذموم کاروبار چلایا جائے۔ یہاں کسی بھی وقت 16 برس سے کم عمر کے بچوں کی تعداد 30 ہزار سے زیادہ ہوتی ہے۔ جو ہر قسم کے گندے دھندے میں ملوث ہیں۔

امریکہ میں فحش تصاویر اور فلموں کا جو مذموم کاروبار ہو رہا ہے۔ اس کاروبار میں 20فیصد کے قریب بچے کام کرتے ہیں یا اس میں ان بچوں کا عمل دخل ہے۔ اس طرح امریکہ میں لاکھوں نابالغ بچوں اور بچیوں کو گھناؤنے افعال میں شرکت پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ امریکہ اور دیگر یورپی ممالک کے معاشرے کا اپنا ایک اقتصادی اور سماجی رنگ ہے۔ تاہم تیسری دنیا کے بعض ممالک بھی اس لعنت کا بری طرح شکار ہو رہے ہیں۔ جہاں اخلاقی و سماجی اقدار کسی حد تک معاشرے میں اپنا مقام رکھتی ہیں مگر ان بچوں اور بچیوں کی اکثریت غربت کے ہاتھوں اس پیشہ میں آئی۔ حکومت کا سماجی پروگرام ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا اور عالمی اداروں کے خصوصی فنڈز اس طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ انسانی حقوق کے تحفظ کا پرچار کرنے والے معاشرتی زندگی کے

اس کراہت انگیز فعل پر خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ عالمی تنظیمیں اس مکروہ دھندے پر لب کشائی کرنے پر قول و فعل کے تضاد کا واضح ثبوت فراہم کر رہی ہیں۔

○

امریکی ریاست نیویارک میں اسقاط حمل کے سب سے زیادہ واقعات ہوتے ہیں۔
ایک اندازے کے مطابق ایک ہزار حاملہ عورتوں میں سے 666 عورتیں اپنے حمل ساقط کرا دیتی ہیں۔ وہ مرد اور عورتیں جنہوں نے شادی کرنے کا تکلف ہی نہیں کیا کل آبادی کا12.20 فیصد ہیں۔

1970ء میں امریکہ میں کل 6 لاکھ 56 ہزار 4 سو 60 بچے پیدا ہوئے۔ جن میں ناجائز بچوں کی تعداد ایک لاکھ 99 ہزار 9 سو تھی۔

1990ء میں 5 لاکھ 62 ہزار 330 بچے پیدا ہوئے۔ جن میں ناجائز بچوں کی تعداد 2لاکھ 8 سو ایک تھی۔ اس طرح امریکہ میں ناجائز بچوں کی شرح پیدائش میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ ان بچوں کی مائیں زیادہ تر نو عمر لڑکیاں تھی۔

1990ء میں ایک لاکھ امریکیوں میں سے 395.90 فیصد افراد سنگین جرائم مثلاً زنا بالجبر کا شکار ہوئے۔

○

امریکہ کی معاشرتی زندگی کے بعض پہلوؤں سے پردہ اٹھائیں تو نہایت خوفناک مناظر سامنے آتے ہیں۔ اس کی تہذیب کی کوئی کل سیدھی نہیں ۔ اس کا فلسفہ زندگی شتر بے مہار کی طرح ہے۔ جدھر منہ اٹھ گیا۔ اسی رخ پر چلتا گیا۔

امریکی زندگی کا فلسفہ یہ ہے کہ ایک فرد کوئی جرم کرے تو وہ مستحق عقوبت لیکن قوم کوئی جرم کرے تو لائق تحسین اور اس کا جرم تہذیب اور قابل فخر طریق زندگی قرار پاتا ہے۔ امریکہ میں جرائم کی رفتار تشویشناک ہے۔

ملک میں قانون کے پرجوش نفاذ اور مجرموں کے ساتھ پولیس کے سخت رویے کے باعث گزشتہ پانچ سال میں جرائم کی شرح میں خاصی کمی ہو گئی تھی 1990ء کے اختتام تک ایک اعشاریہ آٹھ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ مغربی امریکہ میں رہنے والے لوگ زیادہ تر مجرموں کی سرگرمیوں کا شکار ہیں لیکن شمال مغربی امریکہ میں رہنے والے جرائم کی اس لہر سے قدرے کم متاثر ہوئے ہیں۔

بیورو آف جسٹس کے اعداد و شمار کے ایک جائزے میں اس حقیقت کا انکشاف ہو گیا ہے کہ امریکہ میں جرائم کی رفتار خوفناک حد تک بڑھ رہی ہے۔ قومی اعتبار سے گھریلو قسم کے جرائم کی تعداد 6 لاکھ 13 ہزار سے بڑھ کر 3 کروڑ 47 لاکھ تک جا پہنچی ہے۔ نیشنل کرائم سروے کے مطابق 1990ء میں 3 کروڑ 47 لاکھ مقدمات درج ہوئے تھے۔

جرائم میں اضافہ ہونے کے سبب مقدمات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ایڈمنسٹریشن حکام کا کہنا ہے کہ ماضی میں جرائم میں کمی کا سبب عوام کا تعاون سے زیادہ قانون پر سختی سے عمل درآمد کرنا تھا۔ اکیڈمی کے بعض ماہرین نے ان اعداد و شمار کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ جرائم کی رفتار غیر متوقع طور پر بڑھ چکی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ جرائم کا ارتکاب کرنے والے گروپوں کا آپس میں اتحاد ہو گیا ہے جہاں جرائم ہوتے رہتے ہیں اس لیے چاروں قسم کے جرائم مثلاً زنا بالجبر' ڈکیتی' چوری میں اضافہ ہوا ہے ان میں قتل بھی شامل ہے۔ ایف بی آئی کی ایک رپورٹ کے مطابق نیویارک امریکہ میں ڈکیتی کی وارداتوں کا سب سے بڑا مرکز بن چکا ہے۔ گزشتہ سال نیو

یارک میں مجموعی طور پر 93377 ڈکیتیاں ہوئیں۔ جن کا مطلب ہر چھ منٹ بعد ایک ڈاکہ ہے۔ سرکاری ذرائع کے مطابق اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ امریکی عوام میں اسلحہ اور باڈی گارڈ رکھنے کے رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس طرح سنگین جرائم کے سلسلہ میں قتل کی وارداتوں میں واشنگٹن پہلے نمبر پر ہے جہاں عوام پر ہمہ وقت قتل کا خوف طاری رہتا ہے۔

امریکہ اور سوئٹزرلینڈ سمیت یورپ کے دیگر اہم ممالک میں مردوں کی مالش کے لیے مخصوص دکانوں پر نابالغ بچے یہ کام انجام دیتے ہیں۔ ان ترقی یافتہ ممالک میں لائسنس یافتہ "مالش خانوں" کی تعداد سینکڑوں بتائی جاتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں 50 کے قریب مالش خانے قائم ہیں لیکن غیر سرکاری طور پر بہت سے گھروں اور حجاموں کی دوکانوں پر سینکڑوں مالش خانے قائم ہیں جن میں نابالغ بچوں اور بچیوں سے مذکورہ بالا کام لیا جاتا ہے۔

اگرچہ غلامی کے روائتی طور طریقے معدوم ہو چکے ہیں۔ تاہم نئی قسم کی غلامی فروغ پا رہی ہے۔ جس میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں مزدوروں کی منتقلی، بچوں سے زبردستی مشقت و محنت کے کام کروانا، فرد اور خواتین کا استحصال اور خاص طور پر جنسی مقاصد کے حصول کے لیے ان بچوں پر ظلم ڈھایا جارہا ہے یہاں بھی والدین اپنے بچوں کو دولت کی لالچ میں فروخت کرنے لگے ہیں۔ جس کا کچھ سال قبل تک تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

غلامی کی اس قسم کا قلع قمع کرنے کی خاطر مختلف بین الاقوامی اداروں کو مربوط اقدامات کرنے چاہیں کہ والدین اپنے معصوم بچوں کو فروخت نہ کر سکیں

امریکہ کے مشہور شہر نیویارک میں گزشتہ کئی برسوں سے نابالغ بچوں کے اغوا کرنے کی وارداتوں میں تشویشناک حد تک اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اغوا کے پس منظر میں یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ان نابالغ بچوں کو عالی شان ہوٹلوں میں شرمناک افعال کی غرض سے استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ امریکی حکومت نابالغ بچوں کے ان گھناؤ نے

واقعات پر کوئی حتمی فیصلہ کرنے پر مجبور ہو چکی ہے کہ آخر یہ سلسلہ کس طرح ختم ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے میں امریکی محکمہ صحت نے ایک نیا قانون تیار کیا ہے جس کے تحت اگر 18 سال سے کم عمر کسی لڑکی نے وفاقی حکومت کے زیر اہتمام چلنے والے کسی کلینک سے مانع حمل ادویات طلب کیں یا نسخہ لکھوایا تو متعلقہ کلینک اس بات کی اطلاع مذکورہ نابالغ لڑکی کے والدین کو دے گا۔

اس وقت امریکہ کی کل آبادی ساڑھے چوبیس کروڑ ہے۔ جس میں 65 برس یا اس سے زیادہ عمر والے بوڑھے افراد کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اب ہر 8 امریکیوں میں سے ایک 65 سال یا اس سے زیادہ عمر رکھتا ہے گزشتہ دس برس کے دوران 65 برس کی عمر کے افراد میں 21 فیصد اضافہ ہوا ہے جبکہ اس سے کم عمر کے افراد کی تعداد صرف آٹھ فیصد بڑھی ہے۔

اس طرح 85 برس کی عمر کے افراد بھی تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور ان کی تعداد 30 لاکھ ہو چکی ہے۔ سو برس کی عمر پانے والے افراد بھی ان گنت ہیں اس طرح سو برس کی عمر والے افراد کی تعداد 2030ء تک تین لاکھ ہو جائے گی۔ یہ سب کچھ ظاہر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ امریکہ میں نوجوان لڑکیوں نے بوڑھوں سے شادیوں کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ یہی حال یورپ کے مختلف ممالک میں بھی ان دنوں نوجوان لڑکیوں کی طرف سے بوڑھوں کے ساتھ شادی کرانے کا شوق مسلسل بڑھ رہا ہے اس شوق میں گرفتار لڑکیوں کا کہنا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے ایسا کر رہی ہیں

ان لڑکیوں میں سے بعض ایسی ہوتی ہیں جو بچپن میں شفقت پدری سے محروم رہتی ہیں اور یوں ایک بزرگ شوہر کا پیار حاصل کر کے بڑھاپے کی نگرانی کا شوق پورا کرتی ہیں۔ کچھ لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ جو بوڑھوں کی دولت پر ہاتھ صاف کرتی ہیں۔

نوجوان لڑکیوں کا خیال ہے کہ ان سے شادی کرنے والے بوڑھے نوجوانوں سے

زیادہ فراخدل ہوتے ہیں۔ بوڑھوں سے شادی کرنے والی بعض لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی عملی زندگی میں پوری آزادی حاصل کر لیتی ہیں۔ بوڑھا شوہر مجبوراً ان کو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔

○

یورپی ممالک میں اخلاقی اقدار کا زوال اب اس حد تک آ پہنچا ہے کہ ہم جنسی کے خوفناک مرض میں مبتلا لوگوں نے متعدد قرار دادیں منظور کیں ہیں کہ 1992ء کو ہم جنسی کے سال کے طور پر منایا جائے۔ ایک اور قرار داد میں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن سے مطالبہ کیا ہے کہ ہم جنسی کو صحت کی عالمی تنظیم کی بیماریوں کی فہرست سے خارج کیا جائے۔

اٹلی کی عظمت فروش عورتوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اپنا الگ اخبار جاری کر دیا ہے۔ اخبار کا نام "لیوسی کلا" ہے اس اخبار کو اطالوی جسم فروش عورتوں کی نمائندہ تنظیم چلا رہی ہے اس تنظیم کو شکایت ہے کہ ملک میں جسم فروشی پر کوئی قانونی بندش نہیں لیکن اس کے باوجود جسم فروش عورتوں کو بلا وجہ تنگ کیا جا رہا ہے کہ کھیل کے معاملے میں جنس کی بنیاد پر امتیاز کرنا انتہائی ناانصافی ہے۔

برطانیہ میں بھی موجود قانون کو بدلنے کے لیے خواتین سخت کوشاں ہیں کہ جسمانی مضبوطی اور برداشت کی قوت سے مردوں اور عورتوں میں امتیاز نہیں کیا جا سکتا یہ سلسلہ ختم ہونا چاہئے۔ حیرانگی اس بات پر ہے کہ ان کی نظر میں یہ کوئی غیر اخلاقی حرکت نہیں ہے۔ امریکہ میں بے حرمتی اور بدکرداری کے گھناؤنے واقعات میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے عالمی انسانی حقوق کے تحفظ کا دعویٰ کرنے والی تنظیمیں ان مکروہ اور معاشرتی خودکشی کے جرائم پر لب کشائی کرنے پر قول و فعل کے تضاد کا واضع ثبوت فراہم کر رہی ہیں

اگلے روز میں اپنے مہمانوں کے ساتھ ''لونگ وڈ گارڈن'' دیکھنے جا رہا تھا۔ دنیا کا یہ مشہور گارڈن دیکھنے لائق ہے۔ یہاں مصنوعی موسم کے ذریعے دنیا کے مختلف براعظموں میں پائے جانے والے پھل اور پھول نہ صرف اگائے جاتے ہیں بلکہ اس ملک کا ماحول بھی ہوبہو پیدا کیا جاتا ہے۔

اس گارڈن کو دیکھنے کی خواہش اس کی شہرت سننے کے فوراً ہی بعد دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ لونگ وڈ گارڈن اس صدی کا عجوبہ ہے۔ کہیں ٹمپریچر بڑھا کر، کہیں گھٹا کر شیشے کے بڑے بڑے ہالوں میں پھول اور پھل کاشت کرنا سائنس کی ترقی کا کمال نہیں تو کیا ہے۔ یہ گارڈن ڈیلاویر سٹیٹ میں واقع ہے لونگ وڈ 1700ء میں پائر ز خاندان نے کوئیکر خاندان سے فارم بنانے کے لیے خریدا تھا۔ اس جنگل نما باغ کو پائرز فیملی نے بعد میں بنا سنوار کر پائرز پارک کا نام دیا۔

پائرز خاندان کا مسٹر ڈی پانٹ جو جنرل موٹرز کمپنی کا مالک اور ڈیو پاؤنٹ کا چیئرمین تھا لونگ وڑ کا پہلا ڈیزائنر بھی کہلاتا ہے اور آج کا گارڈن اس کے خوبصورت ذہن کی تخلیق ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ دنیا کے اس عظیم ترین گارڈن کو کوئی حکومت نہیں بلکہ ایک پرائیویٹ تنظیم ''منافع کے بغیر'' Not for profet کے اصول پر چلا رہی ہے اور امریکہ کی طرف سے اسے کوئی فنڈ نہ تو کبھی ملا ہے اور نہ ہی انہوں نے کبھی اس کی خواہش کی ہے اور تمام فنڈز مسٹر ڈیو پاؤنٹ کی طرف سے فراہم کئے جاتے ہیں اس

مقصد کے لئے ایک ریسٹورنٹ اور سٹور قائم کیا گیا ہے جس کی ساری آمدن یہاں صرف ہو جاتی ہے۔

لونگ وڈ' 650 ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے جس میں سے 350 ایکڑ عوام کے لئے مخصوص ہے۔ باقی حصہ پرائیویٹ اور شارع عام ہیں۔

"لونگ وڈ" میں 65 باغات قائم ہیں۔ جن میں سے ہر باغ اپنی انفرادیت کے لئے دنیا میں الگ اور ممتاز حیثیت کا حامل ہے اور اس کا ثانی شاید دنیا میں اور کہیں موجود نہ ہو۔300 ورکرز ہمہ وقت اس کی دیکھ بھال کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اس گارڈن میں سارا سال تعلیمی اور تفریحی پروگرام جاری رہتے ہیں۔

○

فلاڈلفیا سے لونگ وڈ گارڈن جانے کے لیے قریباً پچاس میل کی ڈرائیونگ کرنا پڑتی ہے امریکہ کی سڑکوں پر ڈرائیونگ کرنا بہت آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔

بہت آسان اس طرح کہ آپ قانون کا احترام کرنے والے ڈرائیور ہیں تو آپ کے لیے کوئی مشکل نہیں۔ کیونکہ یہاں اکثریت قانون شکنی سے مبرا ہے اور آپ کا واسطہ زیادہ تر اپنے جیسے لوگوں ہی سے ہوگا بصورت دیگر آپ کے لیے بے شمار مشکلات موجود ہیں کیونکہ جیسے ہی آپ سڑک کو فارغ سمجھ کر اپنی سپیڈ متعلقہ قطار کے لیے مخصوص رفتار سے بڑھائیں گے اگلے ہی موڑ پر کوئی نہ کوئی پولیس کا چاق و چوبند ملازم پولیس کار پر آپ کے استقبال کے لیے موجود ہوگا۔

وہ آپ کو صرف اطلاع دے گا کہ اپ نے اپنی رفتار حد رفتار سے زیادہ بڑھائی ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو جرمانے کا ٹکٹ تھما دیا جائے گا۔ حالانکہ آپ کو دوران سفر شاید ہی کبھی پولیس کی پٹرول پارٹی کو دیکھنے کا اتفاق ہوگا لیکن ان لوگوں کا طریق واردات ہم سے ذرا مختلف ہے ہمارے ہاں پولیس حکام خصوصاً ٹریفک پولیس کے اہل کار چوک میں ایک کونے پر مجمع لگا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور قانون کا احترام

کروانے کے جذبے سے قطعی عاری اور مبرایہ لوگ صرف ان لوگوں کے متلاشی رہتے ہیں جو قانون شکنی کریں اور ان کی جیب گرم ہو یا پھر چالان کر دیا جائے ہمارے ہاں چالان کے لیے بھی مجمع درکار ہے جس سکوٹر والے کا پولیس سارجنٹ چالان کرتا ہے اس کے گرد عوام الناس کی ایک منڈی جمگھٹا کیے موجود رہتی ہے لیکن اس کے برعکس قانون کا احترام کرنے والے ممالک کی پولیس عوام پر رعب داب کے بجائے عوام کی حفاظت اور خدمت کو اپنا اصول بناتی ہے اور جدید آلات کی مدد سے کڑی نگرانی کا نظام ترتیب دیا جاتا ہے

قانون شکنی خواہ معمولی ہو یا اس کی نوعیت سنگین ہو جرم کرنے والا کوئی بڑا آدمی ہو یا چھوٹا اس بات کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سزا سے بچ سکے۔

لونگ وڈ گارڈن میں داخلے سے پہلے آپ کو آگاہ کر دیا جاتا ہے کہ آپ کوئی کھانے پینے کی شے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے اس میں حکمت یہ پوشیدہ ہے کہ صفائی کا نظام "قطعاً" متاثر نہ ہو۔ کئی ایکڑ رقبے میں پھیلے اس جنگل نما باغ میں کنٹین جا بجا موجود ہیں جہاں آپ لذت دہن سے بخوبی آشنائی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن باغ میں گھوم پھر کر کھانے پینے کی سخت ممانعت ہے۔

زندہ قومیں اپنی ثقافت کے آئینہ دار مقامات کا اسی طرح تحفظ کیا کرتی ہیں افسوس ہم جو اس معاملے میں برتری کے بہر صورت دعوے دار ہیں اپنے آباؤ اجداد کی یادگاروں کو سنبھالنے کے فن سے بھی آشنا نہیں ہیں اور حالت یہ ہے کہ قدیم عمارات سے ملحقہ جدید بستیاں آباد کرتے ہیں اور کرتے ہی چلے جاتے ہیں کئی آثار قدیمہ تو ان غیر اخلاقی حد تک غیر قانونی بستیوں کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔

○

ں گارڈن کو بلاشبہ بیسویں صدی کا عجوبہ کہا جاتا ہے جہاں شیشے سے بنے مختلف ہال

موجود ہیں اور ہر ہال میں آپ کو ایک الگ دنیا آباد دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً ایک ہال میں جائیے تو یہاں برصغیر پاک و ہند کے پھل' پھول اور درخت ملیں گے۔ یہاں پاکستان اور بھارت میں پیدا ہونے والے پھول اور پھلوں سے لدے پھندے پودے اور درخت نظر آئیں گے۔ ایک اور عجیب بات فرض کیا پاکستان کے پہاڑی علاقے کا کوئی پھول دار درخت موجود ہے وہاں ہو بہو مصنوعی پہاڑی ماحول بھی پس منظر میں پیدا کیا گیا ہے۔ اس طرح اگر صحرائی علاقے کا کوئی پودا دکھانا مطلوب ہے تو وہاں ماحول بھی صحرائی پیدا کیا گیا ہے اور اس کے لیے خاص طور سے ریت بھی اس علاقے سے منگوا کر استعمال کی گئی ہے۔

افریقی ممالک میں پیدا ہونے والے پودے اور درختوں سے متعلق جو ہال مخصوص ہے وہاں جھیل میں لگے ہوئے پودے اور جنگلی مناظر بھی دکھائے گئے ہیں اور ایسے شاندار کہ مصنوعی پر حقیقی کا گمان گزرتا ہے۔

پودوں کی پرورش پرداخت کے لیے ہر ہال کا درجہ حرارت متعلقہ ملک کے موسم کی نسبت سے مخصوص رکھا گیا ہے اور آپ کو متعلقہ ہال میں داخل ہوتے ہی مخصوص قسم کی گرمی یا سردی کا احساس بھی ہوگا ہوا کا تاثر پیدا کرنے کے لیے چھتوں سے پنکھے لٹک رہے ہیں۔

ایک اور قابل توجہ چیز یہاں کی آرائش و زیبائش ہے پودے کو کہیں ہاتھی کی شکل میں تراشا گیا ہے کہیں گھوڑے کی شکل میں کہیں مور بنا دکھائی دیتا ہے تو کہیں بطخ' تراش خراش اتنی عمدہ ہے کہ دور سے دیکھنے پر حقیقت کا گمان گزرتا ہے۔ اس باغ کی تاریخ بہت قدیم ہے اور جنگل نما باغ میں جا بجا پہاڑیاں اور درختوں کے جھنڈ دکھائی پڑتے ہیں ہر پہاڑی اور جھنڈ کے ساتھ ایک الگ دستان وابستہ ہے جس کی تفصیل اس کے سامنے ایک پتھر پر درج ہوتی ہے پتھر کی ایک بڑی سل پر قریباً سو سال پہلے کی بنی ایک گھڑی موجود ہے جس سے سمت اور وقت کا صد فی صد صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

باغ میں داخلے کے لیے جو ہال مخصوص ہے اس کے کونے میں ایک منی سینما بھی بنایا گیا ہے جہاں باغ میں موجود مختلف اشیاء کی مکمل فلم مسلسل دکھائی جاتی ہے تاکہ آپ اپنی دلچسپی کے حصے سے متعلق صحیح راہنمائی حاصل کر سکیں۔ ہفتے کے مخصوص ایام میں یہاں رات کے پہلے پہر روشنی اور آواز کے خوبصورت امتزاج سے مختلف پروگرام بھی دکھائے جاتے ہیں جن کی مدد سے اس جنگل میں موجود کھنڈرات کی تاریخ اسی زمانے کا سا ماحول پیدا کر کے بیان کی جاتی ہے رات کافی دیر گئے ہم یہ شو دیکھ کر واپس لوٹے۔

○

امریکہ میں دن اور رات کے درمیاں کوئی حد فاصل بظاہر دکھائی نہیں دیتی رات یا دن کے کسی بھی حصے میں ہائی وے پر چلے جایئے زندگی اپنے پورے جوبن کے ساتھ رواں دواں دکھائی دیتی ہے صرف یہ ہے کہ رات ہیوی وہیکلز کی نقل و حمل بڑھ جاتی ہے یہاں ایک بڑی دنیا کے اندر چھوٹے چھوٹے بے شمار جہان آباد ہیں اور ہر جہان اپنے اندر اپنی الگ دنیا بسائے ہوئے ہے۔

کسی بڑے شاپنگ سنٹر میں گھسنے کے بعد آپ خود کو الگ دنیا کا باسی جاننے لگیں گے ان سٹورز میں دنیا کی مہنگی ترین اشیاء بھی ہیں اور عام آدمی کی قوت خرید کے مطابق اشیاء بھی انہی میں موجود ہیں

امریکیوں کے پاس یا تو دولت بہت زیادہ ہے یا پھر یہاں شاپنگ کا جنون ہے کسی بھی امریکی کو آپ کسی بھی سٹور یا گروسری سے باہر نکلتے دیکھیں گے تو وہ بنڈیوں سے لدا پھندا دکھائی دے گا۔

ملکی اور بین البراعظمی حیثیت کے بے شمار سٹورز ایسے ہیں جہاں ضروریات زندگی

کی قریباً ہر شے ایک ہی سٹور سے دستیاب ہو جاتی ہے ایسے کسی ایک سٹور میں داخل ہونے کے بعد کھانے پینے کی اشیا سے لے کر سٹیشنری، کپڑے جوتے، میک اپ غرض عام زندگی میں استعمال ہونے والی ہر شے موجود ہوتی ہے۔

ایک ایک چیز کی اتنی بے شمار اقسام ہیں کہ انتخاب ایک مسئلہ بن جاتا ہے ایک ہی طرح کی سینکڑوں قسم کی پتلونیں، سینکڑوں قسم کی قمیصیں، سینکڑوں قسم کے جوتے آپ کی نگاہ انتخاب کے لیے چیلنج بن جاتے ہیں بچوں کے لیے مخصوص کسی شاپنگ سنٹر میں گھس جایئے کئی ایکڑ رقبے پر پھیلے سنٹر میں بچوں کے اتنی بے شمار اقسام کے ملبوسات اور ضروریات زندگی کی اشیاء موجود ہیں کہ دیکھئے تو دیکھتے ہی رہ جایئے گا۔

ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ قریباً ہر دوسرے بڑے سٹور کے مالک یہودی ہیں

شاپنگ کے معاملے میں ہندو کا تعصب ہر جگہ نمایاں ہے کوئی ہندو خواہ وہ گزشتہ ۲۰ سال سے امریکن شہری بن چکا ہے وہ بھی پکا نیشنلسٹ ہے یہ لوگ اپنے انڈین سٹورز سے چیزیں خریدنے کے لیے سو میل کی ڈرائیو کرتے ہیں لیکن کوشش یہی کرتے ہیں کہ اپنے سٹور سے سامان خریدیں۔

یہ بات قابل افسوس ہے کہ پاکستانی مسلمانوں کی اکثریت ایسی ہے جو اپنے پاکستانی سٹورز کی طرف منہ کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ مقام افسوس ہے کہ ہم جو عالمگیر اخوت اسلامی کے داعی بنے ہوئے ہیں اپنے اندر قومی سوچ کو بھی ڈھنگ سے اجاگر نہیں کر سکے۔

○

فلاڈلفیا امریکہ کا پہلا دارالحکومت ہے ہے۔ واشنگٹن کو اس کے بعد دارالسلطنت بننے کا اعزاز حاصل ہوا جب امریکیوں نے آزادی حاصل کی تو۔ فلاڈلفیا کے گرجا گھروں میں خوشی اور مسرت کی گھنٹیاں اتنی شدت سے بجائی گئیں کہ آج "بیل آف

پنسلوینیا" ایک یادگار کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

بیل آف پنسلوینیا" اس عظیم الشان گھنٹی کا نام ہے جس کو خوشی اور مسرت سے بے قابو ہو کر امریکیوں نے اتنی زور زور سے بجایا تھا کہ یہ گھنٹی ٹوٹ گئی تھی آج یہ ٹوٹی ہوئی گھنٹی ایک تاریخی یادگار کی حیثیت سے فلاڈلفیا میں محفوظ ہے جسے دیکھنے کے لیے دنیا بھر کے سیاح ادھر کا رخ کرتے ہیں جو لوگ نیوپارک "لبرٹی و یلیج" دیکھتے ہیں وہ "بیل آف پینسلوینا" بھی دیکھنے جاتے ہیں جسے آزادی کی گھنٹی کہا جاتا ہے۔

امریکہ میں کچھ کھیل جنون کی حد تک مقبول ہیں ایک تو "فٹ بال" دوسرے ریسلنگ بیس بال اور باسکٹ بال وغیرہ خیال رہے کہ امریکہ میں فٹ بال پاؤں سے نہیں ہاتھوں سے کھیلا جاتا ہے۔ اس کھیل کو امریکی جنون کی حد تک پسند کرتے ہیں کسی بھی سٹیڈیم میں چلے جایئے وہاں میچ کے ٹکٹ ایک ہفتے پہلے ہی بک ہو چکے ہوتے ہیں اور کھیل کے میدان میں جوش و خروش کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

اس کھیل کے کھلاڑی ضروری کپڑے اور ہلمٹ پہن کر میدان میں اترتے ہیں اور اپنی جسمانی طاقت اور پھرتی کے بل بوتے پر میدان مارلیتے ہیں۔ بچپن سے فٹ بال بائی پاور کا محاورہ سنتے آئے تھے اس کی صحت اور سچائی کا یقین اس کھیل کو دیکھ کر ہی ہوتا ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ کھلاڑیوں کا زور کم اور تماشائیوں کا زیادہ لگتا ہے اپنی پسند کے کھلاڑی کی حوصلہ افزائی اور داد دینے کے لیے یہ لوگ مجنونانہ حرکتیں کرتے ہیں۔

مٹھیاں بھینچ کر اور گلا پھاڑ کر اتنی زور زور سے چلاتے ہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے سکے۔ میچ جتنی دیر جاری رہتا ہے ایک طوفان سا تماشائیوں کی صفوں میں ہلچل مچائے رکھتا ہے لوگ ہم آواز ہو کر اپنی اپنی ٹیموں کے لیے تیار شدہ گیت کورس کی شکل میں گاتے ہیں۔

یوں جانیئے کہ ایک جذب کا عالم تماشائیوں پر طاری رہتا ہے اور وہ حقیقی معنوں میں کھیل سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

میں اپنے عزیزوں کے ساتھ کشتیوں کے مقابلے دیکھنے کے لیے مقامی سٹیڈیم پہنچا جہاں مجھے معلوم کرنا تھا کہ اس میچ میں کون کون سے پہلوان حصہ لے رہے ہیں۔ طاہرہ نے گاڑی ایک طرف پارک کی اور میں باہر نکل کر ایک نیگرو کی طرف بڑھا جو نزدیک ہی کھڑا تھا میں اس سے صرف پہلوانوں کی تفصیل دریافت کرنا چاہتا تھا۔

لیکن مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہاں بھی ٹکٹوں کی بلیک ہوتی ہے اور اس دھندے میں بھی اپنے نیگرو بھائی پیش پیش ہیں یہاں دراصل امریکن پولیس کی مستعدی کا وہ شاندار مظاہرہ میں نے دیکھا کہ حیرت گم ہو کر رہ گئی۔

جس نیگرو سے میں نے دریافت کیا تھا وہ دراصل ٹکٹ بھی بلیک کرتا تھا خدا جانے اس بھرے پرے ہجوم کے کس کونے میں پولیس کی گاڑی اس کی تاک میں کھڑی تھی جسے ہی اس نے مجھے پہلوانوں کے نام بتائے ایک زناٹے سے میرے دائیں ہاتھ سے پولیس کی تیز رفتار گاڑی کے ٹائر چر چرانے کی آواز آئی دوسرے ہی لمحے پولیس وین میرے سر پر کھڑی تھی جس کی دائیں کھڑکی سے ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے متعلقہ نیگرو کی جیکٹ کے کالر کو مضبوطی سے تھام لیا پولیس والے مجھے" گاہک" مجھے سمجھتے تھے انہوں نے نیگرو کی تلاشی لے کر اس سے آٹھ دس ٹکٹ برآمد کر لئے پھر مجھے پوچھا میں نے کہا صاحبو نہ مجھے ٹکٹ درکار تھا نہ یہ بے چارہ ٹکٹ میرے پاس فروخت کر رہا تھا بس یونہی کسی پرانے گناہ کی پاداش میں قابو آگیا کیا مجال جو پولیس نے مجھ سے اگلا کوئی سوال کیا ہو۔

انہوں نے نوگرفتار کو اپنے ساتھ سوار کیا اور میرا شکریہ ادا کر کے اپنی راہ لی۔

یوں تو امریکہ کے ہر شہر میں کوئی نہ کوئی ایسی شے آپ کو دکھائی پڑے گی جو عجوبہ روزگار ہو خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے کسی ترقی پذیر ملک کے شہری کو کسی ترقی یافتہ اور وہ بھی "سوپر پاور" ملک میں بہت کچھ ایسا دیکھنے کو ملتا ہے جو اس

کے لیے تو نیا ہوتا ہے لیکن ترقی یافتہ دنیا کے لیے پرانا ہو چکا ہوتا ہے۔

○

فلاڈلفیا کا فرینکلین انسٹی ٹیوٹ سائنس میوزیم بھی ایک ایسا ہی میوزیم ہے۔ جو سائنس کے طالب علم کا لیے بڑی دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔

اس چار منزلہ میوزیم میں مختلف موضوعات کے حوالے سے بلاک ترتیب دیئے گئے ہیں۔ پہلی منزل پر سائنس ایڈیٹوریم میں سائیکل والے سیکشن میں دنیا کی قدیم اور جدید ترین سائیکل سے ایجادات کی کہانی کا آغاز کیا گیا ہے۔ جس کے ساتھ ہی کمیونی کیشن کا شعبہ ہے جہاں بیٹھ کر آپ اپنے کانوں پر ہیڈ فون چڑھا کر اور سامنے نصب کمپیوٹر پر نظریں جمائیں تو آپ کو نظام پیغام رسانی کی پوری سمجھ آجاتی ہے۔

اگر آپ دو گھنٹے اس کمپیوٹر کلاس روم میں بسر کریں تو آپ کو کم از کم کمپیوٹر کی مبادیات کا علم ہو جاتا ہے۔ یہیں ایک پلینٹریم میں اجرام فلکی کی فلم دکھائی جاتی ہے یہاں سیاروں کی تفصیلات بہم پہنچانے کے علاوہ خدا کی پیدا کردہ اس عظیم کائنات اور بہت سی دیگر دنیاؤں کا نظارہ بھی ہوتا ہے۔

دوسرے فلور پر پہلی اور انتہائی متاثر کن چیز "دل" ہے۔ انسانی دل کی ایک ایک شریان میں آپ بخوبی سفر کر سکتے ہیں۔ مٹی اور پتھر کی آمیزش سے تیار کردہ یہ "دل" یہاں آنے والے ہر سیاح کو دعوت نظارہ دیتا ہے۔

خون کہاں سے چلتا اور کہاں کہاں سفر کرتا
کہاں پہنچ جاتا ہے تمام تفصیلات یہاں دیکھ لیجئے۔

اسی فلور پر سائنس نیور سنٹر میں آپ کو سائنس سے متعلق تازہ ترین معلومات کمپیوٹر کا ایک بٹن دبانے پر حاصل ہو سکتی ہیں۔ انرجی آئس لینڈ میں پانی کے ذریعے بجلی بننے کا منظر دیکھا جاتا ہے۔

پہاڑوں سے صحراؤں تک ازجی کے سفر کو بڑی خوب صورتی سے مصنوعی ماحول پیدا کر کے واضح کیا گیا ہے الیکٹر یسٹی اینڈ الیکٹرونک سنٹر میں آپ برقیات کی مکمل تاریخ اور طریق کار سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ یہاں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ مختلف نوعیت کے چھوٹے چھوٹے تجربات کر کے ہر نظام سے متعلق ابتدائی نوعیت کی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً" آپ کو یہ علم ہو سکتا ہے کہ بجلی کیسے پیدا ہو سکتی ہے اور کس طرح اس روبہ عمل لایا جا سکتا ہے۔

دوسرے فلور پر ہی ایوی ایشن ہسٹری کا شعبہ موجود ہے یہاں ابتدائی زمانے کے جہازوں سے لے کر جدید ترین سپر سانک طیاروں تک کے ماڈل موجود ہیں اور بتایا گیا ہے کہ قدم بہ قدم کس طرح اس میدان میں ترقی کی منازل طے کی گئی ہیں۔ اسی فلور پر نیشنل میموریل میں تاریخی نوعیت کی سائنسی اشیا رکھی گئی ہیں۔

تیسری منزل پر ایجادات کا تھیٹر' زمینی نوعیت کی معلومات کا شعبہ جس کے ذریعے زلزلے' آتش فشاں اور زمین کی سطح کے نیچے ہونے والے مختلف عوامل سے آگاہی حاصل کی جاسکتی ہے موجود ہیں

اس فلور پر پانی سے متعلق معلومات کا شعبہ بھی قائم ہے جہاں پانی کے حصول کی مختلف تراکیب کا عملی مظاہرہ کیا جاتا ہے۔

چوتھی منزل پر ریڈیو' سیارگان حسابیات کے شعبے قائم ہیں اور ساتھ ہی کلاس روم موجود ہے جہاں داخلہ لینے والوں کو باقاعدہ تعلیم و تربیت بھی دی جاتی ہے۔ اس میوزیم کی خوبی یہ ہے کہ یہ صرف عجائب گھر ہی نہیں بلکہ انسٹی ٹیوٹ بھی ہے جہاں دخلہ لینے والوں کو سائنس کے خصوصی کورس پاس کروائے جاتے ہیں۔

میوزیم میں جابجا چھوٹے چھوٹے کیبن میں رکھے ٹی وی کی سکرین پر مختلف نوعیت کے معلوماتی پروگرام ہروقت جاری رہتے ہیں۔

یہاں پر دکھائی جانے والی بارہ منٹ کی فلم "سنہ ۲۰۰۰ کے لوگ" کو شاید ہی یہاں آنے والا کوئی سیاح مس کرتا ہو۔

یوں تو امریکہ کی ہر ریاست اپنے دامن میں اپنی نوعیت کی ایک الگ دنیا بسائے ہوئے ہیں------لیکن!

کیلے فورنیا کی بات ہی کچھ اور ہے-------

امریکن کیلے فونیا کو "گولڈن سٹیٹ" کہتے ہیں۔

کیلے فورنیا کو بارہ کاؤنٹیوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے "اورنج کاؤنٹی" کا ذکر ہوجائے۔

اورنج کاؤنٹی اپنے خوبصورت طویل و عریض فارم' 42 میل لمبے ساحل سمندر اور سٹرس پھلوں کے طویل و عریض باغات کے سبب سیاحوں کی خصوصی توجہ کی حامل رہتی ہے-----!!

رسیلے پھولوں کے طویل باغات کی مناسبت سے ہی اسے تو "اورنج کاؤنٹی" کہا جاتا ہے

لاس اینجلس اور سان ڈیاگو کے درمیانی علاقے "اورنج" کہلاتے ہیں یہ علاقہ پیسفک کے سمندری ساحل سے "یٹا اینا" کے پہاڑی سلسلے تک پھیلتا چلا گیا ہے۔

اس کاؤنٹی میں سالانہ 15 انچ بارش ہوتی ہے اور عموماً درجہ حرارت 70 ڈگری رہتا ہے۔ کیلے فورنیا کے اس حصے میں سورج عموماً سارا سال اپنی روشنیاں بکھیرتا ہے جو امریکیوں کے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں اور انہیں "یٹاانیا" کے پہاڑی سلسلے سے گرم ہواؤں کے جھونکے بھی میسر آجاتے ہیں

سپین سے آنے والے مشنریوں سب سے پہلے اس علاقے کو 16 ویں صدی کے اور ئل میں آباد کیا تھا بعد میں 17 ویں صدی میں یہ علاقہ سپین کی عملداری میں آگیا۔ اورنج کاؤنٹی کا علاقہ امریکہ کا 15 واں بڑا میٹرو پولیٹن آبادی والا علاقہ شمار ہوتا ہے اور دنیا کی 13 بڑی معیشتوں میں سے ایک معیشت سمجھا جاتا ہے اس کاؤنٹی میں 26 شہر اور 20 لاکھ سے زائد لوگ آباد ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق سال میں 3 کروڑ سے زیادہ سیاح اس کاؤنٹی کے قدرتی اور انسانی ہاتھوں سے تراشیدہ خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے یہاں آتے ہیں۔

جسن تعمیر کے حیرت انگیز مظاہر' بڑے بڑے شاپنگ پلازہ' ہوٹل' شراب خانے اور کلب اس خطے کا طرہ امتیاز ہے۔

ساحل سمندر پر سیاحوں کے قیام اور لطف اندوز ہونے کے لئے خوبصورت ہٹ بنائے گئے ہیں۔ جہاں باد صبح جب علی الصباح راست کو بدمستیوں سے مدہوش ساحل سمندر ان کے مکینوں کو بیدار کرتی ہے تو اس میں موسقی کا ایک عجب تاثر پایا جاتا ہے۔

جی ہاں!

شاید یہ بات آپ کے لئے حیران کن ہو کہ اس ساحلی علاقے میں علی الصباح جو ہوائیں چلتی ہیں ان میں ساحلی ریت سے ٹکرانے کے بعد جو آواز پیدا ہوتی ہے۔ ایسی شاندار اور نیچرل موسیقی بسا اوقات انسان کو مدہوش کر کے رکھ دیتی ہے بالکل ایسے ہی جیسے کبھی کبھی درختوں کے طویل سلسلے میں چلنے والی تیز ہوائیں پتوں سے ٹکراتی ہیں تو ایک سرسراہٹ سی پیدا ہوتی ہے۔

یہاں سیاحوں کو سہولیات مہیا کرنے کے لئے جو یورپین سٹائل کے ہوٹل قائم ہیں ان کے کمروں کی تعداد 38 ہزار ہے اور ان 38 ہزار کمروں میں دنیا بھر کی آسائش

اور عیاشی موجود ہے۔

قریباً 5 ہزار ایسے ریسٹورنٹ ہیں جہاں کام و دہن کی تمام لذتیں خواہ ان کا تعلق دنیا کے کسی بھی کونے یا تہذیب سے ہو موجود ہیں

اس کاؤنٹی کو امریکہ کا "VACATION LAND" بھی کہا جاتا ہے جس کی بڑی وجہ یہاں کا ڈزنی لینڈ ہے۔

1955ء میں والٹ ڈزنی نے مالٹوں کے باغات اور کھیتوں کے طویل سلسلوں کے عین درمیان لاس اینجلس سے خاصے فاصلے پر" ڈزنی لینڈ" تا قائم کیا تھا۔

ان دنوں ڈزنی لینڈ ناٹ بیری فارم" کی چند بلڈنگوں اور سیزناٹ کے فرائیڈ چکن کے ایک ریسٹورینٹ پر مشتمل تھا۔ یہاں بچوں کی تفنن طبع کے لئے ایک "بھوتوں کا ٹاؤن" بنایا گیا تھا۔ جہاں بچوں کو مختلف ماسک پہنا کر بھوت کا روپ اختیار کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا اس ٹاؤن میں ہر طرف بھوت ہی بھوت دکھائی دیتے تھے

آج ڈزنی لینڈ بلاشبہ دنیا کا آٹھواں مجموعہ بن چکا ہے--------- جہاں تفریح ایڈونچر اور سیروسیاحت کے لئے وہ سب کچھ موجود ہے جو انسانی تصور میں آسکے۔ خوابوں کی اس دنیا میں سارے خواب زندہ ہوتے دکھائی دیتے ہیں اور دنیا بھر کے بچوں کے لئے واقعی یہ "خوابستان ہے۔"

اورنج کاؤنٹی میں خوابوں کی اس سرزمین پر کچھ اور تجیرات مثلاً" مووی لینڈ ویکس میوزیم' اور میڈائیول ٹائمز (MEDIEVAL) یہ سب عمارتیں بیونا پارک میں واقع ہیں

اروائن IRVINE میں کروڑوں ڈالر سے تیار کردہ وا ئیلڈرپور کمپلیکس جہاں دریائی جانوروں کے کرتب و کمالات دکھائے جاتے ہیں۔

بیٹارنیا میں مووی لینڈ آف دی ائر میوزیم کا چلڈرن میوزیم جہاں فلموں میں استعمال ہونے والے نئے پرانے جہاز رکھے گئے ہیں۔ لاہیرا کا چلڈرن میوزیم اور ہابی سٹی اور

یا بی سٹی گڑیوں اور کھلونوں کا مرکز جہاں کی منی ایچر ٹرین اور دنیا کے قدیم ترین کھلونے اور گڑیاں جن کا شمار اب نوادرات میں ہوتا ہے رکھے گئے ہیں

اورنج کاؤنٹی میں آنے کے بعد کوئی ڈزنی لینڈ نہ جائے تعجب کی بات ہے------

مجھے بھی ڈزنی لینڈ کی ایک جھلک دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ڈزنی لینڈ کا یہ سفر میں نے اپنے بہت پیارے دوست ڈاکٹر سکھوں کی فیملی کے ساتھ کیا تھا۔ کسی عام آدمی کے لئے جو امریکہ میں رہتا ہو اپنے مہمان کے لئے چند گھنٹے نکال لینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ٹیڑھی ملی انگلیوں سے گھی نکالنا۔

اور---۔

ایک معروف اور مشہور سرجن کے لئے تو یہ بات ناممکن سمجھی جاتی ہے کیونکہ جیسے میں وہ کار ڈرائیو کرنے بیٹھتا ہے۔ اس کی پتلون کی بیلٹ سے بندھا "بیپر" بجنے لگتا ہے جو اس بات کا سگنل ہے کہ فون آگیا ہے۔

یہ فون عموماً مریضوں کا ہوتا ہے یا پھر کسی مریض سے متعلق کوئی اطلاع ------- امریکہ میں مسیحاؤں کے لئے صرف مسیحا بن کر جینا اتنا ناممکن ہے جتنا پاکستان میں کسی ایماندار صحافی کے لئے "صرف صحافی" بن کر جینا۔

ان حالات میں اگر کوئی ڈاکٹر اپنے مہمان کے لئے 24 گھنٹے نکال لے تو اس سے زیادہ بہتر مہمان نوازی کی مثال شاید تاریخ کے اوراق میں بھی نہ مل سکے-------

ہم "ویک اینڈ" یعنی ہفتے کے دن ڈزنی لینڈ کی طرف عازم سفر تھے-----

تین گھنٹے کی طوفانی ڈرائیونگ کے بعد ہم ڈزنی لینڈ کے پارکنگ ایریا میں پہنچ گئے۔

یہ پارکنگ ایریا کیا تھا-----

کاروں کا سمندر تھا------

تاحد نگاہ کاریں ہی کاریں ______.

اگر میں یہ کہہ دوں کہ وہاں شاید آٹھ دس ہزار کاریں موجود تھیں تو پریشان نہ ہو جائیے گا۔ ہزار سے کم تو ہرگز نہیں ہوں گی۔

ذرا تصور کیجئے کہ دس بیس ہزار کاریں ہیں تو آنے والے کتنے ہوں گے؟ اور ایک لمحے کے لئے سوچئے کہ اگر لاہور یا پاکستان کے کسی اور شہر میں کسی جگہ دو سو کاریں بھی اکٹھی ہو جائیں تو کیا طوفان بد تمیزی برپا ہو جائے گا

شاید لاہور کے باسیوں کو 90ء کا وہ مسلم لیگ کا جلسہ یاد ہو جو لاہور کے اقبال پارک میں منعقد ہوا تھا اور جس کے بعد 48 گھنٹے تک لاہور کا راستہ بذریعہ سڑک سارے پاکستان سے کٹ کر رہ گیا تھا۔

صورت حال اتنی اذیت ناک ہو گئی تھی کہ خدا کی پناہ ________ مضافات سے گوالے دودھ لاہور نہیں پہنچا سکتے تھے۔

مال روڑ پر پندرہ آدمیوں کا جلوس نکل آئے تو لاہور کی سب سے بڑی شاہراہ پر میدان حشر برپا ہو جاتا ہے-------- مال روڑ اور اس سے ملحقہ سڑکوں پر وہ قہر مچتا ہے کہ الامان الحفیظ!

نہ کوئی ڈھنگ سے آسکتا ہے نہ جا سکتا ہے---------- ٹریفک جام ---- اور ٹریفک پولیس کے اہلکاروں کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں---

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے زندگی کے بہترین اصول اور سبق کو جو ہمارے قائد نے ہمیں بتایا اور جس نعرے کے ساتھ ہمارے قائد اعظم نے پاکستان کے قیام کی منزل کی طرف قدم بڑھایا بھول گئے-----

میرا مطلب ڈسپلن سے ہے------- تنظیم سے ہے----- !!

امریکن کوئی آسمانی مخلوق نہیں----!

اخلاقیات میں ہم کتنے بھی برے سہی امریکنوں سے زیادہ برے نہیں ---!!

کہنے کی باتیں اور ہیں عملاً امریکہ بھی جرائم کا گڑھ ہے---

وہاں بھی آسمانی فتیں آئے دن نازل ہوتی ہیں۔ زندگی کے وہ تمام ہنگامے جو ہمارے ہاں وقوع پذیر ہوتے ہیں وہاں بھی ہوتے ہیں۔

لیکن----

فرق صرف ایک ہے کہ ان لوگوں نے زندگی کو تنظیم سے گزارنے کا سلیقہ سیکھ لیا ہے۔ وہ ڈسپلین کے پابند ہو گئے ہیں اور ہم نے اس لفظ کو "شجر ممنوعہ" سمجھ کر اپنی زندگی کی ڈکشنری سے نکال کر پھینک دیا ہے۔

امریکہ کی جس سڑک پر نظر دوڑائے ٹریفک کا سیلاب رواں دواں نظر آئے گا۔

لیکن ----

ایک تنظیم کے ساتھ سلیقہ مندی سے۔

دراصل یہی ہے ان کی کامیابی اور ہماری بدبختی کا راز کہ ان لوگوں نے ڈسپلین کو اپنا لیا اور ہم نے دھتکار دیا۔

○

ڈزنی لینڈ کے اس طویل و عریض پارکنگ لاٹ کو درجنوں حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ہر حصے کے سامنے اس کا مخصوص نمبر موجود ہے اور رنگوں کی شناخت اس سے سوا ہے ---- جہاں گاڑی پارک کرتے ہیں وہاں سے آپ کو جو پارکنگ ٹکٹ ملتا ہے اس پر بھی آپ کے پارکنگ لاٹ کا مخصوص نمبر درج ہے تاکہ آپ کو کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

افسوس ہم نے مغرب کی ہر بری عادت اور روایت اپنائی اور ہر اچھی عادت اور روایت سے منہ پھیر لیا۔

پاکستان کی کسی معروف شاہراہ پر کسی شاپنگ سنٹر، کسی پارک، تفریح گاہ یا عوامی اجتماع کی اور کسی جگہ پر آپ کو کبھی ڈھنگ کا ٹوائلٹ نہیں ملے گا-----

اول تو موجود ہی نہیں ہو گا اور لوگ مجبوراً اور عادتاً" عمارت کو گندا کریں گے اگر ہے تو اسی کا حلیہ اتنا بگڑ چکا ہو گا کہ آپ یہاں سے گھر جا کر ہی کچھ کرنا بہتر خیال کریں گے۔

خدا جانے کہ تمام وسائل ہونے کے باوجود ہم آخر صفائی کے نظام ہی کو برقرار کیوں نہیں رکھنا چاہتے جو ہمارے نبی کریمؐ کی تعلیمات کے مطابق ہمارے ایمان کا نصف حصہ ہے۔

یورپی ممالک اور امریکہ میں جا کر اپنی اس ملی بد بختی پر رونا آتا ہے۔

ڈزنی لینڈ میں داخلے کے ٹکٹ پر "پاسپورٹ ٹو ڈزنی لینڈ" لکھا ہوتا ہے ---- جس کے درمیان میں مشہور عالم ڈزنی لینڈ کی تصویر اور اس کے گرد دائرے میں والٹ ڈزنیز میجک کنگڈم کلب درج ہے---!

امریکی معاشرہ حالانکہ قطعی مادیت پرست معاشرہ ہے۔

لیکن ----

ایک بات کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ امریکی زندگی کے ہر لمحے سے اپنے حصے کی خوشیاں ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ "بائی ہک یا بائی کروک"۔

معمولی خوشی پر وہ اچھل کود کریں گے کہ ہم ایسے بے حس اور ڈیپریشن کے شکار لوگ محو حیرت ہو کر رہ جائیں---!

یہیں دیکھ لیجئے----!

جیسے میں ڈاکٹر سیکھوں کے بچوں کے ہاتھوں میں ٹکٹ آئے اور وہ اس طویل قطار میں لگے جس میں پہلے سے سینکڑوں زائر موجود تھے انہوں نے اچھلنا کودنا شروع کر دیا۔

اس قطار میں موجود شاید ہی کوئی چہرہ "سریس" ہو گا۔

خوشی ان کے چہروں سے پھوٹ پھوٹ پڑتی تھی ---- یہ سب لوگ اگر خوش نہ بھی ہوں تو بھی خوش نظر آنے کی کوشش ضرور کر رہے تھے ----

ہس رہے تھے ----

قہقہے لگا رہے تھے----

عجیب عجیب جسمانی حرکات سے اپنی ایکسائٹمنٹ کا اظہار کر رہے تھے اور کئی خواتین تو اپنی خوشیوں میں زبردستی دوسروں کو شامل کر رہی تھیں---- اب مجھ سے یہ نہ پوچھیے کہ اس کا طریقہ کیا ہے؟

شاید آپ کو سن کر خوشی نہیں ہو گی۔

عمارت میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے ڈاکٹر سیکھوں کی بچی پنکی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے قریباً کھینچتی ہوئے ENCHANTED TIKI ROOM تک لے گئی

اس ٹکی روم کے کمالات آپ کو کیا سناؤں اور کیسے سناؤں بس یوں جانیئے کہ ظالموں نے قدم قدم پر دل موہ لینے کا سامان پیدا کر رکھا ہے۔

آپ اس "ٹکی روم" کو ایک چھوٹا سا باغ سمجھ لیجئے جہاں رات کے اندھیرے میں آپ داخل ہوتے ہیں اور آپ پر سویرا طلوع ہونے والا ہے -----

صبح طلوع ہونے کا یہ منظر بڑا دل خوش کن ہے-----

جیسے جیسے سورج اندھیرے کی چادر سے جھانکتا ہے ---- اس کی روشنیاں رنگ بدلتی اور ظلمت کی سیاہ چادر کو چاک کرتی باغ پر اترتی ہیں۔ درختوں کا سویا حسن جاگنے لگتا ہے ----

ظلمت کے لحہ بہ لحہ اجالے کی طرف سفر کرنے کے ساتھ ساتھ ان درختوں اور پودوں پر زندگی انگڑائیاں لینے لگتی ہے ------!

کرن کرن اجالا اترتا ہے تو پرندوں کی مختلف النوع آوازیں ماحول کو سحرزدہ کرنے لگتی ہیں۔

یوں لگتا ہے جیسے پرندے باتوں باتوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں کہ صبح ہو گئی ؟ مختلف پرندوں کی چہچہاہٹ ماحول میں موسیقی کا ایسا تاثر بنا دیتی ہے کہ پھر

دیکھنے والا اس میں ڈوبتا چلا جائے۔

اس گفتگو میں ہر چرند پرند کے ساتھ ساتھ درختوں کی شاخیں' درخت اور باغ میں موجود ہر شے حصہ لیتی ہے اور پتے پتے کی الگ الگ آواز کو اس طرح موسیقی میں سمویا گیا ہے کہ ایک سماں بندھتا چلا جاتا ہے۔

یہ ہے اس شو کی روداد جو ہم نے اس "ٹکی روم" میں دیکھا تھا۔

ننھی پنکی نے مجھے جیسے سارا ڈزنی لینڈ ایک ہی مرتبہ دکھا دینے کا مصمم ارادہ باندھ لیا تھا۔

○

دوپہر گئے تک ہم نے کاؤنٹ بیر جمبوری' جنگل کروز' ہانٹڈ منشن اور پائریٹس آف دی کریبئین کو جیسے تیسے دیکھ لیا ———

یہ سب کیا ہے ----

ٹیکنالوجی اور سائنس کا کمال ہے۔

ہائی ٹیکنالوجی کے ذریعے انسانی فطرت کو سمجھتے ہوئے اس کو ہر ممکن طریقے سے بھلے کچھ دیر ہی کے لئے سہی غم دنیا سے بے نیاز ہو کر "انجوائے" کرنے کے مواقع بہم پہنچائے گئے ہیں۔

ڈزنی لینڈ خوابوں کا جزیرہ ہے ---

لیکن----

یہاں بچے ہی نہیں بڑے بھی خواب دیکھتے ہیں -----!!

خوابوں کی تعبیر دیکھتے ہیں----

خواب یہاں زندہ ہو جاتے ہیں ----

زندہ خوابوں کے سنگ میں نے بھی شام ڈھلنے تک کا وقت یہاں گزارا۔ اس درمیان ہم نے ڈزنی لینڈ مونو ریل کی سیر کی بگ تھنڈر ریل روڈ دیکھا' ایلس ان ونڈر

لینڈ' سب میرین وائیج کا نظارہ کیا۔

رولر کوسٹر پر بیٹھنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی ---!!

حیرت ہوتی ہے کہ امریکن زندگی میں "چیلنج" کے لئے کیا کیا کر گزرتے ہیں۔

ایسی ایسی خطرناک "رائیڈز" لیتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔

عام آدمی تو ان رائیڈز کو دیکھ کر ہی خوفزدہ ہو جاتا ہے۔

لیکن ---

یہ کم بخت امریکی--- ایڈونچر ہی کے لئے سہی۔ ان خطرناک "رائیڈز" پر سوار ضرور ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات کے پھر چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھا لیں گے۔ ایسی خطرناک چیخیں بلند ہوتی ہیں کہ سننے والے کا کلیجہ منہ کو آنے لگے۔

لیکن امریکن اسے "انجوائے" کرنا کہتے ہیں----

اور "انجوائے" اور "چیلنج" کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

رات ایک پہر بیت گئی تھی جب ہم گھر واپس پہنچے۔

امریکہ میں شاید ہی کوئی رات بارہ ایک بجے سے پہلے سوتا ہو گا۔

کیلے فورنیا کی دوسری اہم کاؤنٹی کا نام ''سان ڈیاگو کاؤنٹی'' ہے۔

اپنی خوبصورت جھیلوں اور شاندار موسموں والی یہ کاؤنٹی ''کیلے فورنیا'' کی روائتی زندگی اور رہن سہن کا شاندار عکس پیش کرتی ہے۔ جنگلات سے لدی پھندی پہاڑیاں' تاریخی عمارات' جاذب نظر شاپنگ مال' طویل و عریض زرعی فارم' گولف کے میدان مشہور زمانہ چڑیا گھر اور مشہور عالم ٹیلی سکوپ بے شمار دلچسپیوں میں سے وہ چند دلچسپیاں ہیں جن کی طرف کیلے فورنیا میں آنے والے سیاح کھنچے چلے آتے ہیں۔

سمندر اور پہاڑی سلسلے کے درمیان موجود سان ڈیاگو کا شہر اپنے آپ میں ایک خاصے کی چیز ہے۔ اس کا جغرافیہ ایسا ہے کہ یہاں میلوں لمبا ایک قدرتی ساحل بھی خود بخود سے بنتا چلا گیا ہے۔

سان ڈیاگو کیلے فورنیا کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ پہلا شہر لاس اینجلس ہے۔ سان ڈیاگو کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ساتواں بڑا شہر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

واٹر سپورٹس کی جنت اس شہر میں خصوصی تیار کردہ واٹر فرنٹ ایریا' کورونا ڈو' شیلٹر آئس لینڈ' ہاربر آئس لینڈ اور مشن بے ایریا پانی کے مختلف کھیلوں کے شوقین کھلاڑیوں کو کشاں کشاں اپنی طرف کھینچتا چلا جاتا ہے اور ایڈونچر پسند امریکی اپنی چھٹیاں گزارنے کے لئے ادھر کا رخ کرتے ہیں۔

سان ڈیاگو کی ۱۷ میل لمبی بندر گاہ نیوی کا جہازوں کا اڈہ بھی ہے۔ اس علاقے میں لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں' چھوٹے سمندری جہازوں پر

سمندری ساحلوں کا نظارہ کرتے ہیں۔

سان ڈیاگو کے ۷۰ میل لمبے سمندری ساحل پر جگہ جگہ خوبصورت جھیلیں تراشی گئی ہیں سان ڈیاگو کو امریکہ کا ''سپورٹس ٹاؤن'' بھی کہا جاتا ہے۔ خصوصاً گولف' ٹینس' سائیکلنگ' مچھلی کا شکار' پانی کی سطح کے کھیل اور ہائیکنگ کا سلسلہ یہاں سارا سال زور شور سے جاری رہتا ہے۔

سان ڈیاگو کے میدان اپنے قدرتی حسن اور سبزے کی وجہ سے شاید امریکہ کے بہترین میدانوں میں شمار ہوتے ہیں۔

اسی طرح یہاں کے ساحل جہاں خصوصاً لوگ مچھلی کا شکار کرتے ہیں قدرتی ہاتھوں کی صناعی کا بہترین شاہکار تو ہیں ہی ---- خود امریکیوں نے بھی اپنی زمین کے حسن کو چار چاند لگا دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

سان ڈیاگو کیلے فورنیا کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہی نہیں ہے بلکہ مغربی ساحل پر امریکہ کی بحری فوج اور ہوائی فوج کا بھی سب سے بڑا مرکز ہے۔ اقتصادی لحاظ سے دوسرے نمبر پر سان ڈیاگو کھیتی باڑی کے علاقہ میں چوتھے نمبر پر سمجھا جاتا ہے۔

یہ شہر شمال جنوب اور مشرق کی طرف ۲۰ میل سے بھی زیادہ رقبے میں پھیلا ہوا ہے اور مختلف قوموں کے لوگ یہاں پر رہتے ہیں۔

کسی زمانہ میں مشن بے نام سے مشہور جو حصہ بالکل فضول سمجھا جاتا تھا آج ۴۶۰۰ ایکڑ کا ایک دلکش پارک بن گیا ہے۔ مشن بے کے جنوب مشرق میں واقع پرانے شہر میں خوشحال سپینش میکسین وراثت آج بھی محفوظ ہے اس کے ساتھ ہی شہر میں آرٹ واٹر ٹرانسپورٹ اور کمرشیل شپنگ کے کئی اہم مراکز ہیں۔

اس سے پہلے کہ میں سان ڈیاگو کے بارے میں کچھ عرض کروں اس کی آب و ہوا۔ پہناوہ۔ اخبارات اور ٹی وی وغیرہ کے بارے میں کچھ بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔

سان ڈیاگو کی آب و ہوا کو امریکہ کے لئے سب سے زیادہ مناسب سمجھا جاتا ہے۔ اوسطاً یومیہ درجہ حرارت ۷۰ ڈگری رہتا ہے جب کہ سالانہ اوسط بارش صرف

۱۹اعشاریہ ۵ انچ ہوتی ہے۔ زیادہ تر بارش دسمبر۔ جنوری اور فروری میں ہوتی ہے۔ سردی عام طور پر ہلکی ہوتی ہے۔ گرمیاں شہر میں کافی سہانی ہوتی ہیں اور سب سے زیادہ گرمی اگست اور ستمبر میں پڑتی ہے۔

اس آب و ہوا کی وجہ سے سان ڈیاگو کے لوگ تمام طرح کے کپڑے پہنتے ہیں۔ عورتیں اکثر تمام سال سوتی کپڑے پہنتی ہیں۔ سردیوں میں ہلکے گرم کپڑے اور رین کوٹ بھی استعمال کرتے ہیں مرد اکثر ہلکے رنگوں والے سوٹ پہنتے ہیں۔ سوٹ کے ساتھ ٹائی کا استعمال عام ہو جاتا ہے باہر سے آنے والے لوگوں کے لئے سردیوں میں صبح شام سویٹر یا ہلکی جاکٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔

سان ڈیاگو کے ہر لحاظ سے خوشگوار آب و ہوا سیدھے سادے ڈھنگ کی زندگی اور دوسری پر کشش سہولیات کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ اس شہر کو دیکھنے کے لئے آنے والے بہت سے لوگ بالاخر اسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہیں آباد ہو کر کوئی نہ کوئی کام دھندہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

سان ڈیاگو سے یوں تو چھوٹے موٹے کئی اخبارات شائع ہوتے ہیں مگر یہاں کے اہم اخبار سان ڈیاگو یونین اور سان ڈیاگو ایوننگ ٹریبون ہی اہم ہیں۔ لاس اینجلس ٹائمز بھی روزانہ سان ڈیاگو ایڈیشن چھاپتا ہے۔ اس کے علاوہ سینٹر سٹی نیوز۔ نیوی ڈسپیچ نائٹ لائف ریویو۔ ڈیلی ٹرانسکرپٹ اور سپورٹس ڈائجسٹ بھی سان ڈیاگو کے قابل ذکر اخبارات میں شامل ہیں۔ اتنا ہی نہیں کئی بدیشی زبانوں اور فرقوں کے اخبارات بھی یہاں عام ملتے ہیں۔

اے ایم اور ایف ریڈیو پر بڑے نیٹ ورک اور آزاد سٹیشن دونوں ہی کام کرتے ہیں اور ٹی وی پروگرام بھی کم از کم چار چینلوں' پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی پروگرام ہمارے ہی ملک کی طرح وہاں بھی اخبارات میں باقاعدہ چھاپے جاتے ہیں۔

○

شراب سان ڈیاگو میں عام ہوتی ہے اور صبح ٦ بجے سے بعد دوپہر ۲ بجے تک

شراب خریدی جا سکتی ہے۔

شراب کی فروخت شراب کے سٹوروں اور گروسری سٹوروں پر ہوتی ہے۔ جب کہ پینے کے لئے شراب ریسٹورنٹوں' باروں' پبوں' نائٹ کلبوں اور دوسرے لائسنس شدہ مقامات پر ہوتی ہے۔ ۲۱ برس سے کم عمر کا کوئی بھی شخص نہ تو شراب خرید سکتا ہے اور نہ ہی ریسٹورنٹوں' باروں ' پبوں اور نائٹ کلبوں وغیرہ میں جا کر پی ہی سکتا ہے۔ کسی بھی شراب خریدنے والے یا پینے والے شخص کے لئے مانگے جانے پر عمر کا ثبوت دینا ضروری ہے۔

یوں تو سان ڈیاگو میں تعلیمی اداروں کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے مگر اعلیٰ تعلیم کے معاملہ میں سان ڈیاگو سٹیٹ یونیورسٹی اینڈ دی یونیورسٹی آف کیلی فورنیا اور سان ڈیاگو کیمپس کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں ہی تعلیمی ادارے "سٹیٹ سسٹم" کا اک حصہ ہیں۔ اس کے علاوہ لازولا کا انسٹی ٹیوٹ آف اوشنوگرافی بھی ایک بین القوامی اہمیت کا ادارہ ہے۔

○

سان ڈیاگو میں گھومنے پھرنے کے لئے کار ہی سب سے بہتر ذریعہ ہے۔ زیادہ تر بڑے قابل دید مقامات اور شاپنگ مرکزوں تک کار میں آسانی سے پہنچا جا سکتا ہے۔ شہر کی عام سڑکوں پر کار ۳۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلائی جا سکتی ہے جب کہ ایسی کھلی سڑکوں پر جہاں ٹریفک بہت زیادہ نہیں ہوتی کاروں کی رفتار ۵۵ کلومیٹر فی گھنٹہ مقرر کی گئی ہے۔ یہاں خاص طور پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ مقررہ رفتار کی حد اور رفتار بریکروں پر کاروں کو آئینہ کیا جانا ضروری ہے۔

باہر سے آنے والے ان لوگوں کے لئے جن کے پاس اپنی کاریں نہیں ہیں

ٹیکسیوں کا انتظام ہے ٹیکسیوں کو کرائے پر دینے والی کمپنیوں کے نام و پتے اور ٹیلیفون نمبر آسانی سے دستیاب ہیں۔ کوئی بھی شخص ٹیلیفون کر کے ٹیکسی منگوا سکتا ہے۔

ٹیکسیوں کا کرایہ میٹر کے حساب سے چارج کیا جاتا ہے۔ جو اکثر نارمل ہی ہوتا ہے۔

سان ڈیاگو کے ٹرانسپورٹ سسٹم میں بس سروس کے بعد لائٹ ریل ٹرانزٹ کو اہم مقام حاصل ہے۔

یہاں آنے والے سیاح اکثر سان ڈیاگو ٹرانزٹ کارپوریشن کی بسوں سے سفر کرتے ہیں یہ سروس جولا سے کورونا ڈو' پوائنٹ لوما' لامیا اور ایل کیپون ہوتی ہوئی میکسیکو تک جاتی ہیں۔ ۹۰ء میں یہاں بسوں کا کرایہ ۸۰ سینٹ ہوا کرتا تھا۔

جہاں تک سان ڈیاگو ریل ٹرانزٹ کا تعلق ہے اس کی ٹرالی سروس سان ڈیاگو سے سان شرروئی بین القوامی سرحد تک جاتی ہے۔

ہر پندرہ منٹ کے بعد آپ کو ٹرالی مل جاتی ہے----!!

سان ڈیاگو کے یوں تو ہر پارک کی اپنی انفرادیت ہے لیکن "پالپو آپارک" جو ۱۱۵۸ ایکڑ رقبے میں پھیلا ہے۔ تفریحی اور کلچرل سرگرمیوں کا مرکز بنا رہتا ہے۔ یہاں وقتاً فوقتاً مختلف النوع نمائشیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔

یہاں فورڈ بلڈنگ میں واقع ایرو سپیس کا تاریخی سینٹر امریکہ کی سمندری فوج میں سان ڈیاگو کے اہم ترین رول کا شاہد ہے۔

اسی پارک میں واقع کیلے فورنیا بلڈنگ سپین کی دستکاری کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔

بوٹینکل گارڈن میں رنگ برنگے پھولوں اور پودوں کو دیکھ کر بے اختیار علامہ اقبال کا وہ شعر۔

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیراہن

لبوں پر آجاتا ہے۔

○

اس کے علاوہ یہاں پر ہی ہال آف چیمپئن نامی ایک سپورٹس میوزیم ہے۔ جس میں سان ڈیاگو کے کھلاڑیوں کے آئل پینٹ فوٹو گراف اور یاد گاری نشانوں کا ایک نایاب مجموعہ ہے۔

سپورٹس میوزیم کے علاوہ ایک میوزیم آف مین اور ایک نیچرل ہسٹری میوزیم بھی ہے۔ میوزیم آف مین میں انسان کے ارتقاء کی کہانی جس ڈھنگ سے دھرائی گئی ہے۔ وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ نیچرل ہسٹری میوزیم میں معدنیات اور دیگر قدرتی ذرائع کا زخیرہ ہے۔ اس کے علاوہ اسی پارک میں سان ڈیاگو میوزیم آف آرٹ بھی ہے۔ جہاں امریکی۔ برطانوری اور ایشیائی آرٹ کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اس کے علاوہ اس پارک میں اولڈ گلوب تھیٹر بھی تماشائیوں کے لئے بڑی کشش موجود ہے۔ جسے سان ڈیاگو میں تھیٹر کا گھر کہا جاتا ہے۔ اور ایک ریوبن ایچ فلیٹ سپیس تھیٹراور سائنس سنٹر ہے جو کہ سب سے بڑا پلینی ٹوریم ہے اور جہاں نایاب سائنسی اشیاء اور دیگر قابل دید چیزیں موجود ہیں۔ سان ڈیاگو کا چڑیا گھر دنیا بھر کے سب سے بڑے چڑیا گھروں میں سے ایک ہے۔ جہاں دنیا کے کئی نایاب قسم کے جانور ہیں۔ ۸۰۰ قسم کے ۳۲۰۰ سے بھی زیادہ جانور یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ رینگنے والے جانور بھی یہاں موجود ہیں۔

چڑیا گھر کے گرد جہاں دور دور تک ہریالی ہی ہریالی ہے وہاں آس پاس کے مناظر بھی تماشائیوں کا من موہ لینے والے ہیں۔ اس چڑیا گھر میں سان ڈیاگو کے دیگر قابل دید مقامات کی طرح داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہی ممکن ہے۔ کوئی بھی آدمی اپنے ساتھ کوئی پالتو جانور لے کر نہیں جا سکتا۔

بڑے چڑیا گھر کے راستے میں ہی ڈیڑھ ایکڑ زمین میں بنایا گیا بچوں کا چڑیا گھر آ

جاتا ہے۔ جہاں مقابلتاً" سیدھے سادے قسم کے جانور رکھے گئے ہیں۔ اس چڑیا گھر میں جانوروں کی ایک نرسری بھی ہے۔ یہاں پر ہی سپیس و یلج آرٹس اینڈ کلچر سینٹر ہے۔ جہاں آرٹس اور دستکاری کے قابل دید اور نایاب نمونے بھی بھاری تعداد میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

یہاں سب سے زیادہ قابل ذکر اور قابل دید مقام اولڈ ٹاؤن سان ڈیاگو سٹیٹ ہسٹاریکل پارک ہے۔ یہ جگہ کیلی فورنیا کی پہلی بنیاد کی یاد دلاتی ہے اس میں پرانے سان ڈیاگو کی اصل عمارتیں شامل ہیں۔ نزدیک ہی واقع پریزڈیو پارک میں کیلی فورنیا کے پہلے مشن کی جگہ اور فوجی قلعہ ہے۔

اس علاقہ میں اولڈ ٹاؤن پلازہ جسے سان ڈیاگو کی معاشرت کا بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ اور ۱۸۵۱ء میں بنا پینڈلٹن ہاؤس جو طرح طرح کے فرنیچر کا گھر ہے کے ساتھ ساتھ سان ڈیاگو یونین میوزیم ہے۔ اس کی تعمیر ۱۹۸۸ء میں ہوئی تھی۔ یہاں سے ہی سان ڈیاگو کے پہلے اخبار کی شروعات ہوئی تھی۔

پرانے ڈیاگو شہر کے علاقہ میں ہی سیلی اصطبل و ہیلے ہاؤس۔ سیرا۔ تاریخی میوزیم۔ لائبریری اینڈ ٹاور گیلری اور پوائنٹ لوما جیسے قابل دید مقامات بھی ہیں۔ سیلی اصطبل میں پرانی گھوڑا گاڑیوں کا زخیرہ ہے۔ وہیلی ہاؤس میں پرانی کچہریاں تھیں جب کہ سورا تاریخی میوزیم میں سان ڈیاگو کے ۱۵۶۲ء سے اب تک کی تاریخ کا کیپسول محفوظ ہے یہ جگہ آج بھی اپر کیلی فورنیا میں پادری جونی پریو سیرو کی طرف سے قائم کئے گئے پہلے مشن کی یاد تازہ کرتی ہے۔

جہاں تک پوائنٹ لوما کا تعلق ہے یہ بحرالکاہل اور سان ڈیاگو کی خلیج کو آپس میں ملاتا ہے۔ سردیوں میں سمندر کی پوزیشن میں تبدیلی کے بعد یہاں کی خوبصورتی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

کیلی فورنیا کی تیسری کاؤنٹی ان لینڈ ایمپائر کہلاتی ہے جو پتھریلی لیکن سرسبز پہاڑیوں صحرا اور پھولوں اور پھلوں سے لدی وادیوں پر مشتمل ہے۔ اس کاؤنٹی میں کیلی فورنیا کی تاریخی عمارات اور بے شمار کلچرل سینٹر موجود ہیں۔

کیلی فورنیا کے شمال میں واقع اس کاؤنٹی میں بیک وقت آپ کو برف اور پانی پر پھسلنے کی سہولت حاصل ہے۔

برف سے ڈھکی پہاڑیوں سے کچھ ہی فاصلے پر گرم پانیوں کی جھیلیں آپ کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتی ہیں اور "سبحان اللہ" کہے بغیر نہیں رہا جاتا۔

پانی اور برف سے متعلق جتنے بھی کھیل امریکہ میں کھیلے جاتے ہیں وہ سب آپ کو ایک ہی دن میں "ان لینڈ ایمپائر" میں دیکھنے کو مل جائیں گے۔

اس علاقے کا انگور اور سرکہ اور انگور سے بنی شراب "وائن" ساری دنیا میں اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ یسبوں کے باغات دیکھئے اور دیکھتے چلے جائے بڑے بڑے شہروں سے چند منٹ کی ڈرائیو پر آپ کو جنگل مل جائیں گے۔ جہاں مخصوص قسم کے "پکنک پوائنٹ" بنائے گئے ہیں۔ یہ جنگل سیاحوں کی جنت ہیں۔

دریا کے کنارے آباد شہر اور "سان برنارڈ نیو" کیلے فورنیا کے بہترین اور انٹرنیشنل مراکز ہیں۔ ان شہروں میں خاصے کی چیز انگوروں کے وہ طویل و عریض باغات ہیں جو سیلوں تک پھیلتے چلے جاتے ہیں۔

ریور سائیڈ پر مشہور تاریخی مشن' بوٹانک گارڈنز اور بک بیئر نامی طویل و عریض جھیل دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

سان برناڈیو اور اس کے مفافات میں کھیلوں' ثقافت اور انڈسٹری کے مراکز قائم ہیں' یہیں امریکہ کا مشہور زمانہ "سوک لائیٹ اوپیرا" موجود ہے جہاں امریکہ کے مانے

ہوئے گلوکار اور ڈانسر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں اس علاقے کی "بیس بال ٹیم" جس کا نام "سپرٹ" ہے امریکہ کی بہترین ٹیم شمار کی جاتی ہے۔

بگ بیئر اور ایرو ہیڈ نامی جھیلوں کے کنارے وسیع و عریض جنگلات میں سیاحوں کے لئے خصوصی دلچسپیاں پیدا کی گئی ہیں۔ جہاں کام و دہن کی تمام لذتیں ہمہ وقت پائی جاتی ہیں۔

اونٹا ریو کے علاقے میں اس خطے کی قدیم کھیتی باڑی کے مراکز موجود ہیں۔ یہ علاقے زیتون اور انگور کی پیداوار کے لئے مشہور ہیں۔ یہاں بہترین سرکہ تیار کرنے کی لیبارٹریاں بھی موجود ہیں۔

"پائنیر میموریل پارک" اس کاؤنٹی کا قدیم ترین پارک شمار ہوتا ہے جہاں بھی میکسکین اور ریڈ انڈین آباد تھے۔

شمال میں ۳۶ مربع میل میں کیوکا مونگا کی پہاڑی چوٹیاں موجود ہیں۔ ان پہاڑی چوٹیوں کی اونچائی ۹ ہزار فٹ تک ہے جو اپنی ساخت کے اعتبار سے کوہ پیماؤں کے لئے چیلنج بنی رہتی ہیں اور سارا سال کوہ پیما یہاں آکر اپنا شوق پورا کرتے اور انہیں مسخر کرتے رہتے ہیں۔

اس کاؤنٹی میں "لنکولن میموریل شرائن" موجود ہے جہاں ابراھام لنکن پر کتابوں' تصاویر اور یادگار کا ذخیرہ موجود ہے۔ سان برنارڈ نیو کاؤنٹی میوزیم ۱۸۳۰ء میں قائم ہوا تھا اور یہاں اس علاقے کی قدیم تاریخ سے متعلق معلومات کا نہ ختم ہونے والا زخیرہ موجود ہے۔

کیلے فورنیا کی چوتھی کاؤنٹی کو "گریٹر لاس اینجلس ایریا" کہا جاتا ہے۔

۴۰۸۳ مربع میل پر پھیلی لاس اینجلس کاؤنٹی کو کیلے فورنیا کی رنگا رنگ تفریحات اور ثقافتی سرگرمیوں میں مرکزی مقام کی اہمیت حاصل ہے۔ اس کاؤنٹی کو ENTERTAINMENT CAPITAL OF THE WORLD کہا جاتا ہے۔ اور تجربہ اس پر دلالت بھی کرتا ہے۔

تھیٹر' میوزک' آرٹ' کلچر' میوزیم' سینما ہاؤس' ٹی وی سنٹرز' تصاویر کشی اور کھیلوں کے لئے لاس اینجلس ساری دنیا میں ممتاز مقام کا حامل ہے۔ اس شہر کو "اولمپک شہر" کا اعزاز بھی حاصل ہو چکا ہے۔

۹ ملین آبادی والا یہ علاقہ کیلے فورنیا کا سب سے بڑا میٹروپولیٹن ایریا اور امریکہ کا دوسرا بڑا میٹروپولیٹن شہر کہلاتا ہے۔

لیکن ---

یہاں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔

جھیل' سمندر' پہاڑ' صحرا جہاں سارا سال دھوپ اور گرمی پڑتی ہے۔

پیراکی اور ماہی گیری سے خریداری اور قدرتی مناظر کی نظارہ کشی کے لئے "ایل اے" (لاس اینجلس) سے بہتر جگہ اور کوئی نہیں۔

۱۷۸۱ میں یہاں میکسکو سے گیارہ خاندان آکر آباد ہوئے تھے جنہیں سپین کے گورنر فلپ ڈی نیو نے یہاں بھیجا تھا۔ آپ کو یہاں پرانے کیلے فورنیا کی شاندار جھلک

دکھائی دیتی ہے۔

اس پارک کے مشرق میں ایل اے کا یونین سٹیشن واقع ہے جو امریکہ کا آخری اور بڑا ریل روڈ ٹرمیل سمجھا جاتا ہے ۱۹۳۹ء میں بنایا گیا یہ ٹرمیل آج تک اپنی بہترین کارکردگی کے ساتھ موجود ہے جہاں "ا۔ مٹرک ٹرین" رواں دواں رہتی ہے۔

"ایل اے کی سب سے بڑی خوبی جو کسی بھی سیاح کو اپنی طرف متوجہ کرے گی یہاں کی رنگا رنگ ثقافت ہے۔ سٹیٹ ہسٹاریکل پارک میں موجود اولیورا سٹریٹ OLUERAیہاں کی قدیم ترین سٹریٹ ہے' ایک بلاک لمبی مکیسکن مارکیٹ میکیسکین ہینڈی کرافٹ کا مرکز ہے جہاں آپ کو میکیسکو کی مصنوعات ہی نہیں کھانے اور مکمل ماحول بھی ملتا ہے۔

اس سے چند بلاک دور "چائنا ٹاؤن" واقع ہے۔

یوں تو امریکہ کے بیشتر شہروں میں چائنا ٹاؤن موجود ہیں لیکن ایل اے اور سان **فرانسسکو** کا چائنا ٹاؤن اپنی مثال آپ ہے۔ اس ٹاؤن میں آپ کو ہانگ کانگ' تائیوان' چین اور ویت نام' کمبوڈیا اور شرق اوسط کے دیگر ممالک میں بسنے والے چینی نژاد عوام کا انبوہ کثیر تو نظر آتا ہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چینی ریسٹورانوں' تجارتی مراکز اور ثقافتی سنٹرز کا سلسلہ بھی چاروں طرف پھیلتا چلا گیا ہے۔

چینی اپنے نئے سال کے آغاز پر جن تقاریب کا اہتمام کرتے ہیں ان کا شاندار نظارہ یہاں دیکھنے کو ملتا ہے اسی موقعہ پر مختلف سوانگ رچا کر اور بھوتوں والا لباس پہن کر یہاں چین کے روایتی ناچ پیش کئے جاتے ہیں۔

سوک سنٹر کے نزدیک آپ کو ایک "چھوٹا ٹوکیو" آباد نظر آتا ہے جہاں چاروں طرف چپٹی ناک اور چھوٹے قد والے جاپانیوں کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں جاپانی ریسٹورنٹ' شراب خانے' دکانیں' ہینڈی کرافٹس کے علاوہ مخصوص طرز کے جاپانی ثقافت کے مراکز نظر آتے ہیں جہاں جاپانی طرز کے ناچ' گانے اور دیگر ثقافتی پروگرام دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ہر سال اگست کے وسط میں یہاں شاندار ثقافتی میلہ لگتا ہے جہاں جاپانی باشندے اپنے روائتی تہوار کو بڑے شان و شوکت سے مناتے ہیں۔

اپنی بڑی سفید رنگ کی گھڑی والے مینار کے ساتھ فارمرز مارکیٹ اس شہر کی شناخت بن چکی ہے۔ کبھی یہاں غربت کے ہاتھوں تنگ آئے ۱۸ کسانوں پر رحم کھا کر مقامی لوگوں نے انہیں سٹال لگا کر اپنی سبزیاں بیچنے کی اجازت دی تھی۔ آج یہ جگہ ایک منڈی کی حیثیت اختیار کر گئی ہے جہاں ۱۶۰ سٹالوں پر کیلیفورنیا کی تازہ سبزیاں' پھل اور ہمہ اقسام کا گوشت فروخت ہوتا ہے۔

اس مارکیٹ کے گرداگرد ریسٹورانوں کا ایک جال پھیلتا چلا گیا ہے جن کی خوبی یہ ہے کہ وہاں جو بھی چیز ملے گی وہ تازہ ہو گی---- فریج میں محفوظ نہیں ہو گی۔

○

لاس اینجلس سارا سال کھیلوں کی سرگرمیوں کا مرکز بھی بنا رہتا ہے۔

"بیس بال" کے شائقین کے لئے "ڈوگرز ہیں۔ جن کا قیام ہی "ڈوگرز سٹیڈیم" میں رہتا ہے اور یہاں سرا سال بیس بال کھیلا جاتا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں جہاں اولمپک گیمز ہوئی تھیں اسے "ایل اے ریڈرز" کے فٹ بال مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔

تین گھڑ سواری کے پارک بھی یہاں موجود ہیں جنکے نام "مینٹا انیتا پارک" ہالی وڈ پارک اور ال جالسن پارک ہیں اور وہ ریس ٹریک بھی جہاں گھڑ سواری ہوتی اور جور کھیلا جاتا ہے۔ "لاس اینجلس" کے "لیکرز" (باسکٹ بال ٹیم) ساری دنیا کے کھیلوں کے شائقین کے لئے اک قابل عزت نام ہے۔

میوزک' ڈانس' اوپیرا اور تھیٹر کا حسین سنگم یہاں ایک بڑے کمپلیکس کی شکل میں ۱۹۶۴ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس میں بیک وقت ۳۱۹۷ تماشائیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ جو میوزک کے پروگراموں سے لطف اندوز ہو سکیں۔

۱۷۰۲ سیٹوں کا کا ایک تھیٹر بھی اسی کمپلیکس میں قائم ہے جب کہ ۷۴۲ سیٹوں کا ایک الگ حال میوزیشنوں کی تربیت کے لئے موجود ہے۔

میوزک سنٹر کے جنوب میں چند بلاک کی دوری پر ایل اے تھیٹر سنٹر موجود ہے جہاں ۴ بڑے بڑے ہالوں میں سارا سال سٹیج ڈرامے چلتے رہتے ہیں۔

○

"ایل اے" کے میوزیم بھی مثالی ہیں میوزک سنٹر سے ایک بلاک کے فاصلے پر میوزیم آف کونٹمپریری آرٹ موجود ہے۔ یہ میوزیم پہلے ڈاؤن ٹاؤن میں عارضی بنیادوں پر قائم کیا گیا تھا۔

لیکن ----- بعد میں اسے جاپان کے مشہور ماہر تعمیرات "اراتا آئسوزاکی" نے شاندار عمارت میں تبدیل کر دیا۔

۱۹۸۶ء میں اس عمارت میں امریکہ کے زمانہ امن کی بہترین پینٹنگز جمع کر دی گئی ہیں جس گیلری میں یہ تصاویر رکھی گئی ہیں اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے مصنوعی نہیں بلکہ قدرتی روشنیوں سے مزین کیا گیا ہے۔ یہ بات صرف دیکھنے سے سمجھ آتی ہے کہ کس طرح فنی مہارت کے ساتھ سورج کی روشنیوں کو منعکس کر کے گیلری میں اتارا گیا ہے۔

ڈاؤن ٹاؤن کے جنوب میں واقع "ایکوزیشن پارک" لاس اینجلس کے دو بہترین عجائب گھروں میں سے ایک ہے۔ یہاں کی نیچرل ہسٹری میوزیم کو مغرب کا سب سے بڑا میوزیم کہلانے کا اعزاز حاصل ہے جہاں جانوروں کو ان کے قدرتی ماحول کے ساتھ حنوط کر کے رکھا گیا ہے اور امریکہ کی جنگلی حیات کے تین عظیم مظاہر یہاں موجود ہیں۔

یہاں ایک ہال میں ۶۵ ملین سال پہلے کے پرندوں اور جانوروں کی شباہتیں محفوظ کی گئی ہیں جس کی مثال شاید ہی کسی اور میوزیم میں دکھائی دے۔

دوسرا بڑا میوزیم سائنس اور انڈسٹری سے متعلق اشیاء کا زخیرہ اپنی مکمل معلومات سمیت اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس میں فضائی ٹیکنالوجی' ایوی ایشن' حسابیات' برقیات اور فزکس سے متعلق معلومات کے زخائر جمع ہیں۔

ڈاؤن ٹاؤن کے مغرب میں لاس اینجلس کاؤنٹی میوزیم آف آرٹس موجود ہے تین عظیم الشان عمارات میں یہ میوزیم ۱۹۶۵ء میں قائم ہو تھا۔ اس میوزیم میں امریکن پینٹنگز کے بہترین نمونے' آرمنڈ ہیمر کے جمع کردہ رومن گلاس کا مجموعہ' اور ہندوستان اور اسلامی دنیا کے آرٹ کے بہترین نمونے یہاں موجود ہیں۔

○

اس کاؤنٹی کا دوسرا اہم مقام ہالی وڈ ہے---!!

ہالی وڈ کو دنیائے فلم کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے"۔ "ماؤنٹ لی" پہاڑی سلسلے کو مشہور عالم "ہالی وڈ" کا نشان سمجھا جاتا ہے---- ۱۹۲۳ء میں ۳۰ فٹ کے بڑے بڑے الفاظ پر مشتمل یہ نام یہاں لکھا گیا تھا یہاں جو الفاظ لکھے گئے ہیں وہ HOLLY WOOD LAND ہالی وڈ لینڈ ہیں جو بعد میں مختصر ہو کر ہالی وڈ رہ گیا۔

دنیا کے گوشے گوشے سے فلموں کے شائقین جوق در جوق اپنے پسندیدہ اداکاروں کو جنہیں وہ پردہ فلم پر متحرک دیکھتے ہیں ان کی اصل حالت میں دیکھنے کے لئے یہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔

ہالی وڈ کی گلیوں اور بازاروں کے کسی نہ کسی کونے میں آپ کو دنیائے فلم کا کوئی نہ کوئی عظیم اداکار یا اداکارہ عام انسانوں کی طرح چلتا پھرتا نظر آئے گا۔ افسانوی دنیا

کے ان مکینوں کو نزدیک سے دیکھنے اور محسوس کرنے کا اپنا ہی ایک لطف ہے۔

"ہالی وڈ بلیوارڈ" کے چاروں اطراف سائیکا مور SYCAMORE اور گوور GOWER وائن سٹریٹ، سن سیٹ اور یوکا YUCCA پر آپ کو وہ عمارات دکھائی دیتی ہیں جہاں دنیائے فن کے وہ ستارے رہتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں فلم، ٹی وی، ریڈیو اور میوزک کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔

۱۹۶۱ء میں چیمبر آف کامرس نے یہاں جو "واک آف فیم" قائم کی تھی وہاں اب ۱۸۰۰ فلمی ستارے موجود ہیں اور آئے دن ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

ہالی وڈ کے جنوب میں ہالی وڈ سٹوڈیوز اور میوزیم موجود ہیں۔

○

اس کاؤنٹی کا "گرافتھ پارک" امریکہ کا سب سے بڑا ۴۴۰۰ ایکڑ رقبے پر مشتمل پرائیوٹ پارک ہے اس پارک کے ٹینس کورٹس، پونی رائیڈ PONY RIDES، میری گوراؤنڈ، سوسر فیلڈ، پکنک ایریا اور ۵۰ میل کا کوہ پیمائی سلسلہ اور گھڑسواری کا میدان بے مثال ہے۔

۱۹۶۶ء میں قائم ہونے والا لاس اینجلس چڑیا گھر بین القوامی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ یہاں ۲ ہزار سے زائد جانوروں کو ان کے قدرتی ماحول میں رکھا گیا ہے۔

نومبر ۱۹۸۸ء میں اس پارک میں ۵۴ ملین ڈالر کی لاگت سے

GENE AUTRY WESTERN HERITA میوزیم کا افتتاح ہوا جس کو دیکھنے کا مجھے بھی موقعہ ملا تھا۔

اس میوزیم میں مغربی امریکہ کی مکمل تاریخ سپین کے قبضے سے موجودہ دور تک محفوظ کرلی گئی ہے۔

"بیورلے ہلز" اس کاؤنٹی بلکہ امریکہ کے امیر ترین لوگوں کا رہائشی علاقہ ہے۔ جہاں شاید دنیا کے مہنگے ترین مکانات بنائے جاتے ہیں۔ یہاں کی "روڈیو ڈرائیو RODEO DRIVE لندن کی بونڈ سٹریٹ' نیویارک کی ففتھ ایونیو اور پیرس کی RUE DU FAUBOURG سینٹ میونور کی طرح کا عظیم اور مہنگا ترین شاپنگ ایریا ہے۔

یہاں کے سٹورز میں دنیا کے قدیم ترین نوادرات برائے فروخت رکھے جاتے ہیں اس کاؤنٹی میں سانٹا مونیکا کے خوبصورت ساحل مشرقی ممالک کے سیاحوں کی توجہ اپنی طرف ضرور مبذول کرتے ہیں۔

میسا کیٹا لینا کا مشہور آئس لینڈ بھی کیلے فورنیا کی اسی کاؤنٹی میں شامل ہے اس کے علاوہ سان فرنا نڈو ویلی' پاساڈینا اور "اینٹی لوپ ویلی" بھی شامل ہے جہاں موسم بہار میں کئی ایکڑ رقبے پر آپ کو گولڈن کیلے فورنیا پوپی POPPIES کے کھیت لہراتے نظر آئیں گے۔

حیران نہ ہوں یہ افیم کے پھول نہیں بلکہ کیلے فورنیا کے "سٹیٹ فلاور" ہیں۔

قدرت نے یوں تو روئے زمین کے ہر کونے کو کسی نہ کسی نعمت سے نوازا ہے۔

لیکن ------!

کیلے فورنیا میں قدرت کی عنایات کے وہ وہ مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں کہ انسانی حیرت گم ہو کر رہ جائے۔

ایک ہی سٹیٹ میں اگر ایک جگہ برف ہے تو اس سے چند میل دور کھولتا ہوا پانی اور صحرا بھی موجود ہے۔

''ڈیزرٹ'' بھی کیلے فورنیا کی ہی ایک کاؤنٹی ہے۔

میلوں پھیلتے صحرا اور ان میں کیکٹس کے خود رو پودے اور درخت کبھی نہیں بھلائے جا سکتے۔ اسی کاؤنٹی میں ''ڈیتھ ویلی'' موجود ہے۔

اب کچھ ذکر ہو جائے ایک اور انتہائی دلچسپ کاؤنٹی ''سان فرانسسکو بے ایریا''۔ کا

میں نے سان فرانسسکو جانے کے لئے فلاڈلفیا سے اپنے دوست ڈاکٹر گریوال کے پاس ''ٹریسی'' جانا تھا گویا اس وقت میں امریکہ کے ایک کنارے ''اٹلانٹک'' پر تھا اور مجھے دوسرے کنارے ''پیسیفک'' پر پہنچنا تھا۔

مجھے سب سے پہلے کیلے فورنیا کے شہر ٹریسی جانا تھا جس کے نزدیک سٹاکٹن میں وہ تاریخی گوردوارہ موجود ہے جہاں سے ۱۹۱۳ء میں ''غدر تحریک'' کا آغاز ہوا تھا۔ عذر پارٹی کے کردار سے بحث مقصود نہیں لیکن اپنے زمانے میں چلنے والی اس زیر زمین تحریک نے بھی آزادی کی لہر میں اپنا ایک اہم رول ادا کیا ہے جس کو نظر انداز کرنا تاریخ سے بے اعتنائی برتنے کے مترادف ہو گا۔

امریکی ایئرلائن کی فلائٹ نمبر ۱۰۰۹ پر صبح ساڑھے سات بجے سوار ہو کر میں سوا دس بجے ڈلاس پہنچ گیا۔ اس بات کا خیال رہے کہ امریکہ کے مختلف شہروں میں ٹائم کا فرق ہے۔ نیویارک سے کیلے فورنیا کا وقت تین گھنٹے آگے ہے اسی طرح ڈلاس ایک گھنٹہ آگے۔

ڈلاس سے منسلک فلائٹ، کے ذریعے میں مقامی وقت کے مطابق تقریباً پونے ایک بجے آک لینڈ پہنچ گیا وہاں ورلڈ سکھ نیوز کے مسٹر. ھلر میرے منتظر تھے۔

○

. ھلر صاحب زندہ دل سکھ ہیں۔ کبھی بھارت میں اعلیٰ سروسز میں اپنا سکہ منوایا

اور چلایا کرتے تھے جب سے بھارت سرکار نے سکھوں سے غیر انسانی سلوک شروع کیا اس کے بعد سے سروسز کو خدا حافظ کہہ کر امریکہ چلے آئے اب امریکہ میں سکھوں کے سب سے زیادہ مقبول اور شاید واحد پرچے کے عملہ ادارت سے منسلک ہیں۔ آک لینڈ سے ٹریسی تک ڈیڑھ دو گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ تمام راستے .بھلر صاحب اپنی شگفتگی کے جوہر دکھاتے آئے۔

اس راستے پر سفر کرتے ہوئے آپ کو یوں لگتا ہے جیسے آپ پنجاب کے میدانی علاقوں میں سفر کر رہے ہوں ۔ کہیں تو پوٹھوہار کی طرح سڑک کے دونوں اطراف پہاڑیاں دکھائی پڑتی ہیں اور کہیں دونوں طرف سرسبز و شاداب ہرے بھرے کھیت۔ کہیں راستے میں تھوڑی گرمی اور کہیں شدید سردی' ہر طرح کا موسم' لوگ ' ماحول اور انتہائی زرخیز زمین والی امریکہ کی یہ ریاست وقعی بے مثال ہے یہی وجہ ہے کہ شاید امریکہ کی اہم ترین شخصیات ریٹائرمنٹ کے بعد اس ریاست کو اپنا مسکن بناتی ہیں۔

.بھلر صاحب کی معیت میں جلد ہی میں ٹریسی میں مشہور سرجن اور اپنے میزبان دوست ڈاکٹر گریوال تک پہنچ گیا۔ ڈاکٹر گریوال اس علاقے میں امراض قلب کے واحد اور مستند سرجن تسلیم کئے جاتے ہیں ان کی زندگی بے حد مصروف ہونے کے باوجود ڈاکٹر گریوال ایک سکھ ہونے کے ناطے کبھی اپنی قومی ذمہ داریوں سے غافل نہیں رہے اور اپنی انتہائی مصروفیت کے باوجود سکھوں کے حقوق کی آواز بلند کرنے کے لئے ہر اہم موقع پر موجود ہوتے ہیں۔

میں تو ڈاکٹر گریوال کے گھر آرام کرنے چلا گیا۔ ان کی واپسی شام گئے ہوئی۔ شام کو مقامی صحافیوں اور سکھ زعما نے میرے ساتھ ایک تقریب ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔ جہاں ورلڈ سکھ آرگنائزیشن کے تقریباً سب ہی اہم لیڈر موجود تھے اس محفل کی ایک خاص بات اس کی سادگی تھی ۸۴ء کے بعد سے سکھوں نے اپنے مذہب کو حرزجان بنا لیا ہے اور شراب و کباب سے تقریباً تائب ہو چکے ہیں۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ امریکی روایات کے برعکس یہاں شراب نام کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔ سکھوں کو اس معاملے میں اب خاصی عقل آچکی ہے اس محفل میں بھارتی اور پاکستانی سیاست کے حوالے سے بہت سی باتیں ہوئیں غیر ممالک میں رہنے والے ہر شخص کو اپنے ملک اور قوم سے متعلق کچھ زیادہ ہی تشویش لاحق رہتی ہے۔ یہی ان لوگوں کا مسئلہ تھا۔

ایک صحافی ہونے کے ناطے وہ مجھ سے حالات کرید کرید کر دریافت کر رہے تھے اور جاننا چاہتے تھے کہ مغربی ذرائع ابلاغ سے ان تک پہنچنے والی خبروں کی حقیقت کیا ہے۔

رات گئے تک یہ محفل جاری رہی۔ امریکہ میں رات کے بارہ ایک بجے تک لوگ جاگتے رہتے ہیں۔ اگلے روز ویک اینڈ شروع تھا اور ڈاکٹر گریوال نے مجھے سان فرانسسکو دکھانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔

میں نے دنیا تو نہیں دیکھی لیکن سنا ہے کہ سان فرانسسکو دنیا کے خوب صورت ترین مقامات میں سے ایک مقام ہے امریکہ آکر سان فرانسسکو نہ دیکھنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے کہ پاکستان میں آکر لاہور دیکھنے سے محروم رہ جانا۔ ڈاکٹر گریوال کو ہفتہ وار تعطیل تو نہیں ہوتی لیکن انہوں نے میرے لئے بطور خاص وقت نکالا تھا خود ڈاکٹر صاحب بھی شاید ایک عرصے سے کھلی فضا میں سانس لینا چاہتے تھے۔

یوں تو ٹریسی بھی ایک چھوٹا سا خوب صورت اور انتہائی پر فضا مقام ہے لیکن سان فرانسسکو کی بات ہی اور ہے اور رات دیر گئے سونے کے باوجود ہم صبح جلدی اسی لئے اٹھ گئے تھے کہ ہمیں سان فرانسسکو جانا تھا۔

○

صبح میں اپنے میزبان کے ساتھ سان فرانسسکو جا رہا تھا۔ جو یہاں سے دو گھنٹے

کی دوری پر واقع ہے۔ امریکہ میں فاصلہ بتانے کے لئے عموماً وقت کی اصلاح استعمال ہوتی ہے مثلاً فلاں جگہ کتنی دور ہے؟ کا جواب اکثر یہی ہوتا ہے کہ اتنے گھنٹے کی ڈرائیو ہے؟ ٹریسی سے سان فرانسسکو تک سڑک کے دونوں اطراف خوب صورت نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اب امریکہ میں آسٹریلیا کی طرح پن چکی کا تجربہ بھی کیا جا رہا ہے۔ جو خاصا کامیاب ہے یہاں ایک خاص علاقے میں تیز ہوائیں چلتی ہیں جس کے سبب سے وہاں پہاڑیوں پر پن چکیاں لگی دکھائی دے رہی تھیں۔

ان چکیوں کی مدد سے یہ لوگ اپنی ضرورت کے مطابق اچھی خاصی انرجی حاصل کر لیتے ہیں۔

انرجی صرف پاکستان ہی کا نہیں بلکہ ساری دنیا کا مسئلہ ہے لیکن دنیا کے ہر ملک نے اپنے مقدور بھر ذرائع کے ساتھ اس کا ممکنہ حل تلاش کیا ہے۔ یہ صرف پاکستان کی بد قسمتی ہے کہ ایک اسلامی ملک ہونے کے ناطے ہمارے پر امن ایٹمی پروگرام کو اسلام دشمن طاقتیں ہدف تنقید بناتی رہتی ہیں حالانکہ انرجی کے حصول کے لئے پاکستان کا ایٹمی استعداد حاصل کرنا ناگزیر ہے کیونکہ مستقبل میں اس کے بغیر ہم بہت بڑے بحران کا شکار ہو سکتے ہیں۔

امریکہ میں ہی نہیں دنیا کے ہر ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ملک میں توانائی کے حصول کے لئے ایٹمی توانائی اور سولر انرجی کے حصول پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ خدا کرے ہم بھی سولر انرجی کی قدرتی دولت کو حاصل کرنے کی استعداد پیدا کر سکیں۔

سان فرانسسکو میں داخل ہونے کے لئے "بے برج" سے گزرنا پڑتا ہے یہ دنیا کے طویل ترین پلوں میں ایک پل ہے جس کی مضبوطی اور خوبصورتی بے مثال ہے۔

اس پل کے دونوں اطراف سے شہر کا نظارہ بڑا مسحور کن ہے سان فرانسسکو کو امریکہ میں "ائرکنڈیشن شہر" کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہاں کا موسم ہے جو عموماً خوشگوار رہتا ہے نہ زیادہ سردی نہ زیادہ گرمی۔ شہر میں داخل ہوں تو آپ کو ساری دنیا سے آنے والے قسم قسم کے لوگ اور بھانت بھانت کی بولیاں سننے کو ملیں گی۔

سب سے پہلے نزدیکی "بے" پر پہنچے۔ جہاں سے ٹکٹ خرید کر ایک چھوٹے جہاز کے ذریعے سان فرانسسکو کے تقریباً سب ہی جزیرے اپنی تاریخ سمیت آپ کو دیکھنے اور سننے کو مل جاتے ہیں۔

اس بحری سفر کے دوران گولڈن گیٹ برج کے نیچے سے گزرنے کا موقعہ بھی ملا یہ دنیا کا ایسا شاندار پل ہے جس کے نیچے سے سوائے "انٹرپرائز" کے دنیا کا ہر بحری جہاز گزر سکتا ہے۔ انٹرپرائز کو یہاں سے گزرنے کی اجازت کیوں نہیں اس کا سبب تو امریکن نیوی ہی بتا سکتی ہے لیکن اس بات میں شک نہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا بحری بیڑہ بھی سمندر میں بنے اس پل سے گزر سکتا ہے۔

اس بحری سفر میں تاریخی نوعیت کے جزائر بھی دکھائے جاتے ہیں یہاں جزائر میں وہ عقوبت گھر اور قید خانے بھی واقع ہیں جو اب امریکہ کی تاریخ کا ایک حصہ بن چکے ہیں یہاں آزادی کے پروانوں کو خطرناک قیدیوں کے ساتھ رکھا جاتا تھا اور جہاں سے فرار کی صورت میں سوائے موت کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا تھا۔

انسانی تاریخ بہیمیت اور ظلم کی داستانوں سے بھری پڑی ہے ایسے مظاہر دنیا کی ہر قوم اور ہر خطے میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ آج کے مہذب امریکہ کو دیکھنے کے بعد بڑی مشکل سے یقین آتا ہے کہ ان جزائر میں کبھی ایسے وحشی اور غیر مہذب لوگ بھی آباد تھے اور یہاں کے انسان کو ایسے ایسے بھیانک مظالم اور جبر کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔

سمندر میں موجود چھوٹے چھوٹے جزائر میں واقع پہاڑیوں پر بنے یہ قید خانے امریکہ کے ماضی کی تاریخ ہیں افسوس اپنا ماضی آج سوپر طاقتیں تیسری دنیا میں دہرا رہی ہیں اور ہر طاقتور ملک غریب اور کمزور ملک کو اپنے استحصال اور جبر کے جبڑوں میں جکڑے ہوئے ہے۔

اس سفر میں آپ کو تاریخی نوعیت کے بحری جہاز بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہاں ہمیں مشہور عالم "بل کلوتھا" نامی مرچنٹ شپ بھی دکھایا گیا جو ۱۸۶۶ء میں تیار ہوا تھا اور اپنے زمانے کے عظیم ترین بحری جہازوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔

سان فرانسسکو کے نیشنل میری ٹائم میوزیم میں ایسے تاریخی نوعیت کے جہاز موجود ہیں۔ جن کو گھوم پھر کر دیکھنے کی اجازت ہے لیکن مفت نہیں۔ امریکہ میں مفت کچھ نہیں ملتا۔ الا یہ کہ ایئر پورٹ پر اترنے کے بعد اگر آپ اپنے سامان کے لئے دستی ٹرالی بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ایک ڈالر مشین میں ڈالنے کے بعد آپ کو مل سکتی ہے بصورت دیگر اپنا سامان سر پر اٹھایئے یا فرش پر گھسیٹئے۔

سان فرانسسکو میں ساحل سمندر پر جہازوں میں خوب صورت ریستوران بنائے گئے ہیں۔ جہاں کام و دہن کی لذت کے تمام سامان موجود ہیں میں ان کا بھرپور نظارہ نہیں کر سکا کیونکہ یہ سب میرے دائرہ اختیار سے باہر تھا۔ خدا کا شکر ہے میں پاکستانی مسلمان ہوں۔

ڈاکٹر سید انور علی اسلامک ریسرچ سنٹر نیویارک کے ڈائریکٹر ہیں اور مسلمان بچوں اور قیدیوں کی اصلاح کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ان سے یہاں ملاقات ہوئی اور ان مسائل پر جو بات چیت ہوئی وہ کچھ اس طرح ہے۔

سوال ..... ڈاکٹر صاحب امریکہ میں مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کا کیا انتظام ہے؟

جواب ..... دینی تعلیم اسلامک سنٹر میں عموماً ہفتے اور اتوار کو دی جاتی ہے تین چار گھنٹے میں کوشش کی جاتی ہے کہ پورے ہفتے لادینیت نے بچوں کے دماغ پر جو اثرات مرتب کئے ہیں ان کی اصلاح کی جائے۔ میں سمجھتا ہوں مستحسن سہی لیکن ناکافی ہے کچھ جگہ سکولوں کی تعمیر کی کوشش بھی کی گئی ہے جہاں مجوزہ نصاب کے ساتھ دینی تعلیم دی جائے اور ان اسباق کو نصاب سے خارج کیا جائے جو اسلامی تعلیمات سے متصادم ہیں۔ کیلی فورنیا میں ایک ایسا سکول ہے نیویارک میں روز ویلی میں جہاں دن بھر بچے اسلامی ماحول میں تعلیم پاتے ہیں۔ باقی اکثریت میں مسلمان سمجھتے ہیں کہ شاید چند گھنٹے کا قیام ہفتے بھر کی سیاہ کاری کو مٹا سکے گا کچھ ادارو نے آپس میں اشتراک سے

ایک سلیبس بنانے کی کوشش کی ہے جو ہر جگہ چل سکے لیکن یہ کوشش ابھی بار آور نہیں ہوئی۔

سوال... آپ کے ذہن میں اس کا کوئی قابل عمل حل موجود ہے؟ یہ حقیقت مدنظر رہے کہ یہ غیر اسلامی ملک ہے جہاں کے تقاضے ہمارے اسلامی ممالک سے الگ ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں جس طرح یہودیوں نے اپنے الگ سکول کھول رکھے ہیں۔ مسلمان اس طرح نہیں کر سکتے؟

جواب.... یہودیوں کے لئے یہ صورت اس لئے بھی ہے کہ وہ مل جل کر ایک علاقے میں رہتے ہیں ان کی تعداد نیویارک' فلوریڈا' کیلی فورنیا میں خاصی ہے اور ایک جگہ رہنے کی وجہ سے اپنے سکول کھولنے میں آسانی ہے افسوس یہ ہے کہ بحیثیت ایک قوم اپنا الگ تشخص جتانے کی ہم میں وہ رمق نہیں ہے کہ ہم آئیں اور کہیں کہ ہم بحیثیت مسلمان یا پاکستانی ایک جگہ رہیں گے اور دینی فرائض ادا کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہماری مسجد' مکتب ہوں گے جہاں ہمارے بچے ہماری اقدار کے مطابق تعلیم حاصل کریں گے ضروری یہ ہے کہ لوگ ایک علاقے میں رہیں نیویارک میں بروک لین میں پاکستانی مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ ممکن ہے آئندہ آٹھ دس سال میں انشاء اللہ یہاں سے کانگریس میں بھی پاکستانی مسلمان ہو گا۔ اگر ہم پندرہ بیس پچاس میل کے فاصلے پر رہیں' ایک دوسرے سے ملنا پسند نہ کریں تو ہماری اقدار وہی ہوں گے جو ہمارے یہودی یا عیسائی ہمسایوں کی ہوں گی اس مسئلے کا پہلا حل یہی ہے کہ ہم یکجا ہو جائیں۔

سوال .... ڈاکٹر صاحب یہ مسائل تو دیگر اقلیتوں کو بھی درپیش ہیں۔ یہودیوں ہی کو لیجئے ان میں بھی فرقہ واریت ہے کمیونسٹ ہیں۔ کنزرویٹو ہیں' آرتھوڈکس ہیں لبرل ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے بچوں کی تعلیم کی فکر کرتے ہیں کیا ہم فرقہ واریت سے بلند ہو کر یہ کام نہیں کر سکتے؟ اگر ہم میں اتحاد نہیں ہو سکتا تو کم از کم اپنے اپنے مسلک کے مطابق ہی بچوں کی تربیت کریں۔

جواب..... اتحاد بالخصوص ایسے معاشرے میں جہاں آپ کا مقابلہ اسلام دشمن طاقتوں سے ہے بے حد ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ یہ طاقتیں عالم اسلام کی پستی اور ذلالت کی ہمیشہ سے خواہاں رہی ہیں ہماری مشکل یہی رہی ہے کہ اختلافات فرقہ واریت ہی کے نہیں ہیں بلکہ فرقوں میں بھی آپس میں طبقات ہیں جو ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ میں اگر کہتا ہوں کہ لبنان پر بمباری کرنے والے اسرائیلی طیارے کے پائلٹ اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ بم کسی سنی پر گرے یا شیعہ پر اسی طرح دشمن یہاں بھی اسلام اور مسلمان کی بات کرتا ہے وہ پاکستانی ایرانی اور افغانی کی بات نہیں کرتا چلئے اگر ہم اکٹھے نہیں ہو سکتے تو اپنے مسالک کے مطابق اپنے بچوں کی اسلامی تعلیم و تربیت کریں ممکن ہے آئندہ علاقائیت صوبائیت کو بھول جائیں اور صرف اتحاد بین المسلمین کو اپنا لیں۔

سوال...... ڈاکٹر صاحب امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد یہودیوں سے دو گنا ہے امریکہ میں بیشتر ریاستوں میں بہت سستی زمینیں مل رہی ہیں جہاں یہودی اپنی کالونیاں آباد کر رہے ہیں کیا مسلمان اس حکمت عملی کو نہیں اپنا سکتے؟

جواب..... نیویارک سے باہر اس کے علاوہ مغربی علاقوں میں بھی زمین ارزاں ہیں۔ واشنگٹن میں بنراسکا میں کنساس میں بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں زمین ارزاں ہے اور یہودی وہاں قبضہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ جہاں یہودیوں کا قبضہ ابھی نہیں ہوا وہ مڈویسٹ یا ساؤتھ ویسٹ کے علاقے ہیں وہ ریاستیں جہاں آبادی پانچ یا دو ملین ہے اگر وہاں ایک ملین مسلمان آباد ہو جائیں تو بہت سے فوائد مل سکتے ہیں لیکن افسوس ہم اتنے کیمپوں میں بٹے ہیں اور اتفاق رائے بہت کم ہوتا ہے۔ میں نے صرف ایک مسئلے پر مسلمانوں کو متحد دیکھا ہے اور وہ فلسطین کا مسئلہ جس میں ماضی میں لوگ یکجا تھے اور ہر ایک مسلمان نے بلا تمیز وطن یہ محسوس کیا تھا کہ فلسطین کی جنگ عالم اسلام کی جنگ ہے ہمیں ایسے ایشو لینے چاہیں۔ جس پر امت مسلمہ متفق ہے۔ اصل میں یہاں جو مسلمان ہیں ان کی مختلف اقسام بن گئی ہیں کچھ وہ ہیں جو یہاں دولت کی

چمک دمک سے متاثر ہو کر آتے ہیں اور امریکی سے زیادہ امریکی بننا چاہتے ہیں۔ عیسائی سے بڑھ کر عیسائی بننا چاہتے ہیں۔ اپنے مذہب ملت یا اپنی روایات سے تعلق کا خیال نہیں رہا۔ وہ مسلمان جو یہاں کی عورتوں سے شادی کرتے ہیں وہ اپنے گھر میں اسلامی ماحول پیدا نہیں کر پاتے۔ ویک اینڈ کو تفریح یا گھر کی صفائی تک مخصوص رکھا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو ویک اینڈ پر بچوں کو اسلامی سنٹرز میں لاتے ہیں۔ دینی و ملی اسلام کا درد رکھتے ہیں اور انہی کی کوشش سے کچھ کامیابی ملی ہے اب بچوں نے حفظ بھی کرنا شروع کر دیا ہے اور ہمارے کچھ بچے ماشاء اللہ اب تبلیغ کی طرف بھی متوجہ ہیں لیکن یہ انفرادی مثالیں ہیں ابھی تک اجتماعیت کی صورت نہیں بنی۔ اگر تنظیمیں ہیں بھی تو علاقائی اور لسانی بنیادوں پر۔ اب یہاں کالے مسلمانوں کی ایک تنظیم ہے جو اپنے ہی طبقے کا خیال رکھتی ہے لیکن ان کی اکثریت چونکہ نو مسلموں کی ہے اس لئے ابھی تک ان میں عیسائیت کسی حد تک موجود ہے یہ بے چارے کسی اور کی بات سننے کو تیار نہیں ہوتے اور اپنی بات کو حرف آخر سمجھتے ہیں۔ ہمیں کوشش کرنی ہو گی کہ لوگوں کو ایک جگہ جمع کریں اور انہیں بتائیں کہ اگر آپ سے کوئی سوال کرتا ہے تو آپ کی تحقیر نہیں کرتا۔ اسے مطمئن کرنا ضروری ہے۔

سوال .... ڈاکٹر صاحب آپ مسلمان قیدیوں کی فلاح کے لئے بھی کوشاں رہتے ہیں اور اس سلسلے میں مختلف جیلوں میں جاتے ہیں کیا مسلمان قیدیوں کو امریکی جیلوں میں اپنے مذہبی شعائر پر آزادی سے عمل پیرا ہونے کی آزادی حاصل ہے؟

جواب .... نہیں جتنی آزادی یہودیوں یا عیسائیوں کو حاصل ہے مسلمانوں کو حاصل نہیں' سب سے بڑی مشکل ذبیحہ گوشت کی ہے۔ حلال کھانے کی ہے عام طور پر حلال کھانا دستیاب نہیں۔ سوائے چند جیل خانوں کے اگر قیدیوں میں مسلمان دس پندرہ ہیں تو انہیں اجتماع کی بھی اجازت نہیں ہوتی کچھ جیل خانے ایسے ہیں جہاں رمضان میں سحری کی بھی اجازت نہیں ہے بڑی مشکل سے کچھ جیل خانوں میں تراویح کی اجازت ملی تھی۔ لیکن اکثر جگہ ایسا نہیں ہے اور افطار اور سحری کو کھانا نہیں ملتا۔

طہارت کا انتظام نہیں ہے پھر بھی مسلمان قیدی اپنے طور پر کوشش کرتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا ہے کہ نماز جمعہ ایک سیاسی اجتماع ہے اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اسی فیصلے کو جیل خانے والے ہر جگہ اپلائی کر کے نماز جمعہ پر بھی پابندی لگا سکتے ہیں۔ یہ قانون تلوار کی طرح ہر وقت مسلمان قیدیوں کے سر پر لٹک رہا ہے۔ علاوہ ازیں دیگر مذہبی تقریبات کی بات یہ ہے کہ وہ ہفتے یا اتوار کو ہوں تو اجازت ہے بصورت دیگر نہیں۔ مثلاً عید اگر بدھ کو ہے تو آپ ہفتے کو منا سکتے ہیں۔

عید کے دن عید کی تقریبات نہیں ہو سکتیں۔ سچائی یہ ہے کہ مسلمانوں سے بہت تعصب برتا جاتا ہے بظاہر ایسا تاثر دیا جاتا ہے جیسے وہ لوگ ایسا نہیں کرتے۔

سوال.... ڈاکٹر صاحب مسلمانوں کے خلاف تعصب کی اس فضا میں یہودیوں کا ہاتھ کس حد تک کار فرما ہے؟۔

جواب.... بڑی حد تک اس کی ذمہ داری میڈیا اور یہودیوں پر ہے کیونکہ پریس پر بھی زیادہ قبضہ یہودیوں کا ہی ہے کالجوں' یونیورسٹیوں میں ان اداروں میں جو رائے عامہ کو ہموار کرتے ہیں وہاں بیشتر یہودیوں کا قبضہ ہے اور وہ مسلم دشمن فضا کو برقرار رکھتے ہیں۔ تعصب جتنا ان کی تحریروں میں ہے وہ عیسائیوں کی تحریروں میں نہیں ہوتا خصوصاً مسلمانوں سے۔

گولڈن گیٹ پارک ایک تاریخی اور طویل و عریض پارک ہے جہاں کی ایک ایک شے مسحور کن اور قابل توجہ ہے سب سے پہلے "کنزرویٹری" سے سابقہ پڑتا ہے ہری ہری گھاس پر دنیا بھر کے پھول اکٹھے کر دیئے گئے ہیں جن کے پس منظر میں سفید رنگ کی خوبصورت بلڈنگ اور اس کی تعمیر کا انداز کسی بھی دل والے کا دل موہ لینے کے لئے کافی ہے۔

گولڈن گیٹ پارک پر ہی ایشین آرٹ میوزیم قائم ہے۔ نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس میوزیم میں ایشیائی آرٹ کے شاہکار رکھے ہیں شاید ہی کسی ایشائی ملک میں اتنا شاندار میوزیم دیکھنے میں آتا ہو۔ گولڈن گیٹ پارک کے ایک حصے میں جاپانی ٹی گارڈن دیکھنے کی چیز ہے۔ اس گارڈن میں داخل ہونے کے بعد یہاں لکڑی کی چھجے دار عمارات دیکھ کر آپ کو فوراً احساس ہو جائے گا کہ آپ جاپان کے کسی باغ میں گھوم پھر رہے ہیں۔

اسی طرح یہاں کا ڈوینگ میوزیم شرق اوسط جاپانی اور چین کے شاہکاروں سے مزین ہے۔ گولڈن گیٹ پارک کا میوزک کنکورس اور گھنے جنگل والا حصہ غرض کہاں کہاں کی بات کی جائے ہر مقام اپنی ایک انفرادیت ایک تاریخ رکھتا ہے۔

سان فرانسسکو میں آنے کے بعد اگر آپ نے کروکڈ سٹریٹ نہیں دیکھی تو کچھ نہیں دیکھا دنیا بھر کے سیاح یہاں آتے ہیں اس سٹریٹ کو پیچدار گلی کا نام اس کی عجیب و غریب ساخت کی بنا پر دیا گیا ہے۔

یوں تو سارا سان فرانسسکو پہاڑی پر واقع ہے لیکن یہ گلی خاص طور پر اتنی ٹیڑھی میڑھی اور اونچی نیچی ہے کہ اسے دیکھ کر قدرت کی صناعی پر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر گریوال کے ساتھ کار میں بیٹھا جب میں گلی میں گھوم رہا تھا تو مجھے بے ساختہ ایبٹ آباد کی پہاڑی سڑک یاد آرہی تھی لیکن کروکڈ سٹریٹ اس پہاڑی سڑک کی طرح کشادہ نہیں ہے بلکہ ایسی خمدار اور سانپ کی طرح بل کھاتی اوپر سے نیچے کی طرف آتی ہے کہ اس پر ڈرائیونگ کرنا بڑی مہارت کا کام ہے یوں تو امریکہ کے قریباً ہر بڑے شہر میں چائنا ٹاؤن موجود ہیں لیکن سان فرانسسکو کے چائنا ٹاؤن کی نظیر شاید ہی کہیں اور مل سکے۔

چائنا ٹاؤن میں داخلے سے پہلے ایک بڑا دروازہ آپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتا ہے لیکن یہ کوئی لکڑی کا دروازہ نہیں بلکہ دو بلروں پر چھوٹی سی چھت بنا کر اس پر چینی تصاویر اور نقش نگاری کے ذریعے ان کی انفرادیت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس وسیع و عریض ٹاؤن میں گلیوں اور سڑکوں کا ایک جال سا بچھا ہے جس پر سفر کرتے ہوئے آپ چین کی تہذیب و ثقافت کو زندہ روپ میں موجود پائیں گے یہاں کے چائنیز ریسٹورینٹ اپنی خاص شہرت کی وجہ سے سارے امریکہ میں مشہور ہیں۔

سان فرانسسکو میں بھارت نے اپنا قونصل خانہ کھول رکھا ہے۔ جس سے ملحقہ بلڈنگ میں غدر تحریک کی یادگار محفوظ ہے دراصل یہ وہ عمارت ہے جہاں سے غدر تحریک نے اپنا پہلا اخبار جاری کیا تھا یہاں اس زمانے کی بہت ہی اس تحریک سے متعلقہ یادگاریں وابستہ ہیں جن پر بھارتی حکومت قابض ہے۔

○

غدر تحریک کے واحد زندہ غدری بابے مکھن سنگھ نے اس سلسلے میں جو کچھ بتایا

اس کا ذکر میں اگلی نشست میں کروں گا مختصرات یہ ہے کہ اس یاد گار کو بجائے غدر تحریک کے لوگوں کو سونپنے کے امریکی حکومت نے بھارت سرکار کے حوالے کر دیا ہے جہاں ہندو نے اپنی ذہنیت کے مطابق اصلی تاریخ کا تیا پانچہ کر کے اپنی علیحدہ تاریخ تیار کر لی ہے۔ جس سے بابا مکھن سنگھ نے علیحدگی کا اعلان کر رکھا ہے۔

اس کا کہنا ہے کہ غدر تحریک کا سب سے بڑا دشمن گاندھی تھا اور انگریزوں نے جن ہندو جاسوسوں کو ہم میں داخل کیا تھا جنہوں نے اس تحریک کو اپنی غدر داریوں کی وجہ سے تباہ کر دیا اور جن کو ہم تحریک کے غدار کہتے ہیں ہندو سرکار نے تاریخ سے دھاندلی کر کے انہی غداروں کو ہیرو بنا رکھا ہے۔

رات گئے ہم ٹریسی واپس لوٹ آئے-----!!

اگلے روز کیلی فورنیا سے اگلی ریاست نواڈا کے مشہور عالم شہر "رینو" جانے کا پروگرام بنا۔ "رینو نواڈا کا مشہور تفریحی مقام ہے لیکن یہاں جانے کے بعد احساس ہوا کہ یہاں کی واحد اور یکتائے مثال تفریح یہاں کے جوا خانے ہیں۔ بلاشبہ "رینو" کے جواخانے لاس ویگاس کی طرح دنیا بھر کے امیر کبیر جوئے بازوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کا سامان اپنے پاس رکھتے ہیں۔

اس سے پہلے میں اٹلانٹک سٹی دیکھ چکا تھا لیکن یہاں کا منظر دیدنی تھا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر عالم اسلام کی بے بسی اور بد قسمتی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ یہاں بڑی بڑی امارات کے شہزادگان ایک ایک رات میں ہزاروں ڈالر لٹا کر داد عیش دیتے اور مغربی ساہو کاروں کی جھولیاں بھرتے ہیں۔ ان نامی گرامی جوا خانوں میں انسانی نفسیات کے مکمل مطالعے کے بعد ایسے ایسے خوبصورت پھندے ڈالے گئے ہیں جن سے بچ نکلنا کار دارد ہے۔ جو ایک مرتبہ یہاں داخل ہوا دوبارہ ویسا برآمد نہیں ہوتا۔ یہاں لوگ اپنی دانست میں شاید جیتنے کے لئے آتے ہوں گے لیکن یہاں سے جیت کر کوئی نہیں جاتا۔ سب ہار کر جاتے ہیں کیونکہ یہاں نظام ہی ایسا پیچیدہ لیکن بظاہر جاذب نظر اور ہوسناک ترتیب دیا گیا ہے۔ جس میں کوئی جیت نہیں

سکتا سوائے ان لوگوں کے جن کا "جیک پاٹ" لگ جائے۔ اتنے اتنے بڑے جواخانے ہیں کہ ایک میں گھس جایئے تو رات تک باہر نکلنے کی مہلت ہی میسر نہیں آتی۔

اپنے دام تزویر میں لوگوں کو پھانسنے کے لئے طرح طرح کے جال جواخانوں کے مالکان کی طرف سے بچھائے جاتے ہیں مثلاً آپ اگر ایک مخصوص وقت تک اس شہر کے کسی بھی جواخانے میں جوا کھیلیں تو آپ کو پارکنگ مفت فراہم کی جائے گی۔ اگر مزید زیادہ وقت کے لئے کھیلیں تو ڈنر اور لنچ مفت ملے گا۔ اور کچھ وقت گزاریں تو رات گزارنے کے لئے کمرہ بھی مفت فراہم کیا جائے گا۔ دوران کھیل آپ کو ہمہ اقسام کے مشروبات اپنی جگہ پر ملتے رہیں گے۔ سبب اس کا یہی کہ آپ کو تھکن یا بیزاری کا احساس نہ ہونے دیا جائے کم از کم اس وقت تک جب تک آپ قلاش نہ ہو جائیں۔

یہاں کی مشہور اور چونکا دینے والی شے کا نام ہے۔ "ہیلو ہالی وڈ ہیلو" جو دو گھنٹے پر مشتمل ایک شو ہے۔ اس شو میں واقعی ایسے ایسے کمالات پیش کئے جاتے ہیں کہ انسانی حیرت گم ہو کر رہ جائے۔ آواز' روشنی اور سٹیج کا اس سے بڑھ کر خوبصورت استعمال شاید دنیا میں کسی اور سٹیج پر نہ کیا جاتا ہو۔

ایک منظر میں اگر کسی ساحلی علاقے کا ڈانس وہاں کی مخصوص منظر کشی کے ساتھ جاری ہے تو بمشکل ایک منٹ بعد صحرائی علاقے کا منظر اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ آپ کو دکھائی پڑے گا۔ دو گھنٹے میں کم از کم چالیس تا پچاس مختلف آیٹم پیش کئے جاتے ہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ ہر آئٹم وہی فنکار پیش کرتے ہیں جو اس مکمل شو کے لئے مخصوص ہیں۔

جتنی پھرتی اور تنظیم کے ساتھ یہ لوگ اپنے لباس اور سٹائل کو تبدیل کرتے ہیں اس سے تو یہی احساس ہوتا ہے جیسے یہ فنکار کمپیوٹر سے نکل کر آ رہے ہوں۔ یہ برق رفتاری شو کے آغاز سے اختتام تک برقرار رہتی ہے اور کہیں بھی تسلسل ٹوٹنے کا احساس نہیں ہوتا شنید ہے کہ اس شو میں بھلے چالیس پچاس اداکار حصہ لیں لیکن اس

کی ترتیب و تدوین میں سینکڑوں تکنیک کار حصہ لیتے ہیں اور یہ شو امریکہ کے مشہور ہدایت کار ترتیب دیتے ہیں۔

ٹریسی سے رینو تک سڑک کے دونوں اطراف مختلف موسم اور مختلف مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کہیں آپ کے دونوں اطراف دیو قامت پہاڑ سر اٹھائے کھڑے ہیں تو کہیں ڈھلوانوں پر سکیننگ کرتے امریکی نظر آتے ہیں۔ کہیں سڑک پر برف گر رہی ہے اور کہیں دھوپ اپنے مکمل جوبن کے ساتھ سایہ فگن ہے۔ امریکہ بدلتے موسموں اور رنگ برنگی دنیاؤں کا ملک ہے۔ اس کے سپرپاور ہونے کا احساس اس ملک کے طول و عرض میں گھومنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ ایک خوبی جو امریکی اور یورپی قوموں میں دیکھنے کو ملتی ہے وہ اپنے نوادرات' تاریخی مقامات اور کلچر سے ان کا عشق ہے۔ کسی ریاست میں کوئی بھی قابل دید مقام اگر ہے تو امریکیوں نے اس کی سج دھج کا مکمل اہتمام کر رکھا ہے اور ہر جگہ سیاحوں کے لئے بھرپور تفریح اور قیام و طعام کی سہولت بہم پہنچائی گئی ہے جب کہ ہمارے ہاں بدقسمتی سے یہ خانہ بالکل خالی ہے۔

○

خدا نے پاکستان کو قدرتی حسن کی جس بے پایاں دولت سے مالا مال کر رکھا ہے اس پر جتنا بھی شکر ادا کیا جائے وہ کم ہے۔ خصوصاً شمال مغرب میں پہاڑی سلسلہ اور شاندار وادیاں جیسے سکردو' گلگت' کیلاش' سیاچین وغیرہ ہیں افسوس عالمی سطح پر نہ تو ان مقامات کی تشہیر کا کوئی خاطر خواہ بندوبست کیا گیا ہے نہ ہی مستقبل میں ایسی کوئی صورت دکھائی پڑتی ہے۔ محکمہ سیروسیاحت نے صرف ویو کارڈز شائع کرنے یا وقتاً" فوقتاً" اشتہارات شائع کروانے تک ہی اس سلسلے کو محدود کر رکھا ہے۔ نہ تو یہاں ڈھنگ کے ریسٹورنٹ تعمیر کئے گئے ہیں نہ ہی ٹرانسپورٹ کا کوئی خاطر خواہ بندوبست کیا گیا ہے۔ اگر ایسا کچھ ہے بھی تو وہ اتنا مہنگا ہے کہ عام آدمی کی دسترس سے ہی باہر دکھائی دیتا ہے۔

ساری دنیا گھوم جایئے۔ آپ کو وادی کیلاش جیسا قدرتی حسن کا شاہکار کہیں دکھائی نہیں دے گا۔ لیکن افسوس آج بھی وادی پر اسرار کی تہہ جوں کی توں پڑی ہے جو آج سے ہزاروں سال پہلے موجود تھی۔ اس کے برعکس بیشتر یورپی ممالک اور امریکہ میں اگر کوئی بھی معمولی دلچسپی قدرت نے فراہم کی تھی تو ان لوگوں نے اس کو تراش خراش کر قابل دید بنا دیا ہے۔

رینو سے رات دیر گئے واپسی ہوئی۔ دسمبر کا مہینہ اور سرد موسم کی عذاب ناکیاں سڑکوں تک ہی محدود ہیں۔ یہاں گھروں کاروباری مراکز اور دفاتر میں موسم کے اثرات محسوس نہیں ہوتے۔ کیونکہ اندرونی ماحول موسم کے مطابق ترتیب دے لیا جاتا ہے اگر ٹھنڈک یا گرمی ہو تو وہ باہر ہوتی ہے اندر موسم نارمل اور انسانی صحت کے مطابق ہوتا ہے۔

○

امریکہ میں مختلف تجارتی تنظیموں کے پیمانوں پر پورا نہ اترنے کی وجہ سے وہاں کے تجارتی طبقہ میں اپنے اعلیٰ حکام کے استعمال کے لئے نجی ہوائی جہاز رکھنے کا رجحان عام ہے امریکہ کی ایک پرائیویٹ ہوائی سروسز ایسٹرن ایئر لائنز کے باس **فرانسسکو** ولارنیزو کا ذکر کرتا ہوں جس نے اپنے ہوائی سروس گروپ کو دیوالیہ پن کے دہانے تک بھی اپنے ہی ہاتھوں پہنچایا اور اتنی بھاری لیبر بے چینی پیدا کی جو بنا کر ۱۹۸۹ء میں پانچ دن کی ہڑتال کے بعد اس ہوائی سروس کے ملازم ٹی وی پر اس کا پیغام سننے کے لئے میامی کے یونین ہال میں پہنچے تو ٹی وی کے سکرین پر لار۔لیزو کا چہرہ ابھرتے ہی انہوں نے بکرے بلانے شروع کر دیئے اور لارنیزو کو سننے سے انکار کر دیا۔

ایسٹرن ایئر لائنز وہی ہوائی سروس ہے جس کے ہوائی جہاز پر میں نے سان **فرانسسکو** سے لاس اینجلس تک کا اس وقت سفر کیا تھا جب کہ ایک دوسری ہوائی سروس میں ہڑتال کی وجہ سے میرے دورہ کا پروگرام درہم برہم ہونے کا خطرہ پیدا ہو

گیا تھا لیکن بعد میں اسی ہوائی سروس میں ایسی لیبر بے چینی پیدا ہوئی کہ خود ایسٹرن کے وجود کے لئے ہی خطرہ پیدا ہو گیا میرے امریکہ سے لوٹنے کے بعد آخر کار ایسٹرن کے باس **فرانسسکو** لارنیزو کے سرمائے دارانہ رویہ کے خلاف اس کے ملازمین نے بھی ہڑتال کر دی۔

۱۹۸۹ء کے ۲۰ مارچ کے نیوز ویک میں لارنیزو کی کارگذاری کی جو تفصیل شائع کی گئی وہ سرمائے دارانہ استحصال کی منہ بولتی کہانی ہے۔ ہڑتالی مزدوروں کا کہنا تھا کہ وہ ایسٹرن کو تو چاہتے ہیں لیکن لارنیزو کو نہیں جسے انہوں نے بے رحم اور لالچی قرر دیا ان کے مطابق لارنیزو کا دماغ کسی شیطان کے کارخانہ سے کم نہیں تھا۔

ایسٹرن ایئر لائنز میں حالات بگڑنے کی وجہ لارنیزو کی دھن کی ہوس اس حد تک جا پہنچی کہ اسے امریکہ میں بد ترین باس کے نام سے پکارا جانے لگا کیونکہ اس نے امریکی قانون کے چیپٹر ۱۱ کے تحت اپنی دین داریوں سے کنارہ کرنے کی کوشش کی۔ حالات اس حد تک پہنچ گئے کہ زیادہ تر مبصرین نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یا تو لارنیزو اپنے زیادہ تر روٹ اپنی سبارڈینیٹ کانٹی نینٹل ایئرلائنز کو فروخت کر دے گا یا پھر ان تجارتی حریفوں کو جنھوں نے انہی دنوں "ایسٹرن" کی تجارتی سرگرمیوں میں ٹانگ اڑانی شروع کر دی تھی۔ یہاں تک کہ ایک مشہور ہوائی سروس ٹی ڈبلیو اے کے منتظمین نے تو لارنیزو کی تمام ہوائی سروس کے لئے اس سے بات چیت بھی شروع کر دی تھی۔

○

اس سے کچھ ہی عرصہ پہلے لارنیزو نے کہا تھا کہ وہ ایسٹرن کو چالو رکھنا چاہتا ہے۔ بھلے ہی یہ بہت چھوٹی کمپنی بن کر کیوں نہ رہ جائے لیکن ایسٹرن میں ہڑتال سے اس کے تئیں عوام کا اعتماد بری طرح مجروح ہوا۔ اس کے ہوائی جہازوں کی بار بار رد ہونے والی پروازوں سے عوام کا اس میں باقی بچا ہوا اعتماد بھی اٹھ گیا امریکیوں کو

لارنیزو کے بارے میں اگر کچھ معلوم تھا تو وہ بس اتنا ہی کہ وہ ایک ایسا جرات مند صنعتکار ہے۔ جس نے جہاز رانی کے اصولوں میں "ڈی رگولیشن" کئے جانے کا فائدہ اٹھایا تھا۔ یہ جہاز رانی صنعت کی سب سے بڑی ہستی کے روپ میں جانا جانے لگا تھا اور ۱۸ برس کی مدت میں اس نے امریکہ کی ہوائی سروسز پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ پہلے اس نے ایسٹرن ایئر لائنز پر قبضہ کیا پھر کانٹی نینٹل پر اس کے بعد "پیپلز ایکسپریس" پر اور اس کے بعد اپنی سرپرست کمپنی "ٹیکساس ایئر" کو دنیا کی سب سے بڑی ہوائی سروسز کو کنٹرول کرنے والی کمپنی میں تبدیل کر دیا۔ اس عمل میں اس نے بار بار یونینوں اور انڈسٹری کے قانونی اور اصولی بندھنوں کی دھجیاں اڑائیں اور "یونین توڑ" کے روپ میں مشہور ہو گیا۔

لارنیزو کو جاننے والے لوگ اس کے بارے میں بس اتنا ہی جانتے ہیں۔ اس کی پرائیویٹ زندگی لوگوں کو بہت کم ہی دیکھنے کو ملی ہے۔ اس کے بارے میں لوگوں کو جو کچھ معلوم ہے وہ بس اتنا ہی کہ لارنیزو ایک بے حد پرائیوٹ قسم کا آدمی ہے اور اس کی سنک کا حال یہ تھا کہ اگر اسے پتہ چل جاتا کہ اس سے انٹرویو کرنے آیا اخبار نویس اپنے سوالات کا مرکز اس کی کمپنی کو نہ بنا کر اس کو بنانے والا ہے تو وہ اپنا انٹرویو اس اخبار نویس کے ساتھ عین آخری وقت پر بھی رد کر دیا کرتا تھا۔

جب نیوزویک کے نامہ نگار نے اس سے پوچھا کہ اس پر کئے جانے والے ذاتی حملوں کا اس کی زندگی پر کیا اثر ہوا ہے تو اس نے بے حد سیدھے سادے ڈھنگ سے جواب دیا کہ "میں نے اور میرے خاندان نے اسے پسند نہیں کیا"۔ اب تک اس کے بارے میں اس کے شعبہ عوامی رابطہ نے صرف اسی طرح کے حقائق جاری کئے ہیں جن میں اسے بے حد متحرک۔ عام ہستی دوڑ لگانے۔ اچھی صحت اور لذیذ کھانے کے رسیا کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ جن لوگوں کا اس کے ساتھ لمبے عرصہ سے ساتھ ہے وہ اس بات سے متفق ہیں کہ اپنے نجی لین دین میں وہ بے حد فراخدل رحم دل اور عقیدت کا کردار تھا جب کہ دوسرے لوگ اسے سنکی اور ذہین

شخص تسلیم کرتے تھے۔ ایک ایسا شخص جو اپنے کام میں تو بہت محنت کرتا تھا لیکن سوشل سیمیناروں وغیرہ میں لوگوں کے ساتھ بہت زیادہ کھلتا نہیں تھا۔

○

بے شک لارنیزو لوگوں کے درمیان رہنے میں اپنے آپ کو آرام میں محسوس نہیں کرتا تھا لیکن طیاروں کے آس پاس رہنے میں اسے ہمیشہ خوشی محسوس ہوتی تھی نیویارک میں اپنے بچپن میں وہ جہاں رہتا تھا اس کا وہ گھر لوگا ڈیا ہوائی اڈہ کے نزدیک ہی تھا جہاں اسے طیاروں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے کا کافی موقع ملا کرتا تھا۔ ہارورڈ بزنس سکول سے گریجویٹ کی ڈگری لینے کے بعد اس نے ایک ہوائی سروس کے اقتصادی تجزیہ نگار کی نوکری کرلی اور اس کے بعد ایک جہاز رانی صلاحکار کمپنی پر اپنا قبضہ جما لیا اور پھر اس کی بلند خواہشات اتنی بڑھیں کہ اس نے اپنے لئے کچھ ہوائی جہاز خریدنے کا فیصلہ کرلیا اور آج وہ اتنی بڑی ایئرلائن کا مالک تھا۔

امریکہ میں کسی کروڑ پتی ارب پتی کے متعلق یہ سوچنا کہ یہ ہمیشہ امیر رہے گا بڑا عجب سا لگتا ہے۔ اس کی بہترین مثال پیٹر ٹرمپ ہے۔

پیٹر ٹرمپ اٹلانٹک سٹی میں امریکہ کے سب سے مہنگے جواخانے "تاج محل" کا مالک ہے۔ وہ بلا شبہ امریکہ میں جوا خانوں کا بے تاج بادشاہ تھا۔ ریئل سٹیٹ کا اس کا کاروبار نقطہ عرج کو چھو رہا تھا لیکن ۱۹۹۱ء کے آغاز میں وہ بھی گردش حالات کا اس بری طرح شکار ہوا کہ "بنک کرپٹ" ہو گیا۔

۱۹۹۰ء کے آخری مہینے امریکہ میں ریئل سٹیٹ کا کاروبار کرنے والوں کے لئے تباہی اور بربادی کے مہینے تھے وہ لوگ جو کروڑوں میں کھیلتے تھے کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے۔

ایسا کیوں ہوا؟

اس کے پس پردہ امریکی سیاست کا وہ گھناؤنا کردار ہے جس کی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی محض حکومت کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے اچانک امریکی ماہرین معاشیات نے ایسی پالیسیاں بنائیں کہ عوامی سرمایہ دھڑا دھڑ عوام سے حکومت کو منتقل ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے بڑے بڑے بزنس مین بنکوں کے مقروض ہو گئے۔

○

آیئے آپ کو کیلے فورنیا کے دارالحکومت سیکرامنٹو لئے چلیں ----!!

کچھ تعارف کرواتا چلوں۔ سیکرامنٹو کی تاریخ ۱۵۰ سال پرانی ہے ---- لیکن امریکہ کے ان دس شہروں میں شامل ہے جس کی آبادی برق رفتاری سے بڑھی یعنی جہاں لوگ بہت تیزی سے آباد ہوئے۔ آبادی بڑھنے سے کوئی اور مطلب نہ لیجئے۔ یہ شرف دنیا میں صرف ہمیں ہی حاصل ہے امریکہ میں شاید دنیا میں سب سے زیادہ تیز رفتاری سے آباد کاری بڑھتی ہے اور ہمارے ہاں آبادی -----!!

۱۸۳۹ء میں سوئٹرزلینڈ کے ایک صاحب جان آگٹس شوئر یہاں امریکن دریا کے کنارے اترے اور جانے کیا موج سمائی من میں کہ پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

تب یہ میکسیکو کا علاقہ تھا اور گورنر الوریڈو نے کمال شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جان آگٹس صاحب کو ۴۸۰۰۰ ایکڑ رقبہ بھی عنایت فرما دیا یہ بالکل ایسی ہی عنایت تھی جیسی انگریز بہادر کبھی اپنے غلاموں کے ساتھ کیا کرتا تھا ---- کہ صاحب بہادر کو اگر کسی غلام کی کوئی ادا پسند آئی تو اسے کہہ دیا کہ بھگا لو خالی زمین پر گھوڑا ----- اور جتنا گھوڑا اس نے بھگایا ایک مخصوص وقت تک وہ زمین پھر اس کی ہو گئی۔

اب یہ الگ بات کہ بعد میں یہ غلام جب آزاد ہوئے تو ہمارے بدیسی آقاؤں کی طرح ''دیسی آقا'' بن کر ہماری گردنوں پر اس بری طرح مسلط ہوئے کہ آج تک مسلط ہیں اور اترنے کا نام نہیں لیتے۔

لیکن ----

سیکرامنٹو میں ایسا نہیں----

امریکن آزاد قوم کے باشندے ہیں اور یہی ان کا طرہ امتیاز ہے کہ وہ خود کو غلام نہیں سمجھتے۔

جان آگٹس نے جس وادی میں قیام کیا اس کا نام "نیو ہیلویٹایا" رکھا جو بعد میں یورپی آباد کاروں کی جنت بنا --- اور یہاں سے پھر یورپ کے ساتھ تجارتی اور معاشرتی رابطے بھی استوار ہونے لگے۔

اپنی رہائش کے لئے جان آگٹس نے یہاں ایک چھوٹا سا مکان بنایا ہو گا جو بعد میں قلعے کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ قلعہ ایک طرح سے نوواردوں کے لئے ری سیپشن کا کام دیتا رہا۔

۱۸۴۸ء میں سیکرامنٹو کا یہ علاقہ امریکہ کا حصہ بن گیا۔ جان نے یہاں لکڑی کی مصنوعات تیار کرنے کی مل قائم کر لی تھی جہاں پر تلاش روز گار کے لئے لوگ آنے لگے۔ ایک روز اسی مل کا ایک ملازم نے مل سے ملحقہ دریا سیکرامنٹو کے پانی میں کوئی چمکدار شے دیکھی اور اس اٹھا لایا۔

یہ سونا تھا----!

○

بس پھر کیا تھا سونے کی تلاش میں یورپ کے کونے کونے سے ہم جو ادھر امڈتے چلے آئے سونے کی پہلی کان کا مالک جان خود قرار پایا پھر اس کے بیٹے نے زمام اقتدار سنبھالی اور ایک نیا شہر "سیکرامنٹو" کے نام سے آباد کیا۔

۱۸۵۰ء میں اس شہر کو کیلیے فورنیا کی یونین میں شامل کر لیا گیا۔

۱۸۵۴ء میں سیکرامنٹو کو کیلیے فورنیا کا دارالحکومت بنا دیا گیا۔

موسم ساز گار' سونا اور جنگلات کے حسن نے سیکرامنٹو کو یورپی آباد کاروں کا مرکز

نگاہ بنا دیا اور دیکھتے ہیں دیکھتے یہاں جدید بستیاں آباد ہونے لگیں۔

سیکرامنٹو کی شہرت اس کے درخت ہیں۔ جو سڑکوں کے کنارے قطار اندر قطار کھڑے ہیں خوبصورت ہوٹل' وکٹورین طرز تعمیر کے حامل خوبصورت مکانات اور دریائے کنارے خوبصورت مناظراور بھرپور زندگی کی تمام تر لذتوں کی حامل عارضی رہائش گاہیں اور سب سے بڑھ کر سیکرامنٹو کا اولڈ سٹی۔

سیکرامنٹو میں مغربی امریکہ کا پہلا آرٹ میوزیم اور کیلے فورنیا کا پہلا تھیٹر قائم ہوا۔۔۔۔۔ اس شہر کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہاں پہلی مرتبہ ڈاک کا باقاعدہ نظام قائم ہوا اور ریل کا "ٹرانس کونٹی نسل" سسٹم بھی یہیں وجود پذیر ہوا۔

۲۷ ویں سٹریٹ اور ایل سٹریٹ کے درمیان جان آگٹس شوئر کا وہ تاریخی قلعہ موجود ہے جو شہر کے پہلے آباد کار نے قائم کیا تھا اسے اب ریاست کے ایک تاریخی پارک کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔

اس سے ملحقہ سٹیٹ انڈین میوزیم موجود ہے جہاں قدیم آرٹ کے شاہکار محفوظ کئے گئے ہیں۔ اس میوزیم میں آپ کو قدیم آبادکاروں کے کلچر' رسوم و رواج اور پہناوے کا علم ہو جاتا ہے اور ایک بات جو خاص طور پر حیران کرتی ہے وہ اس دور کے یورپی آباد کاروں کا ترقی یافتہ شعور تھا۔

ان لوگوں نے زندگی کی ابتدا ہی منصوبہ بندی سے کی تھی اور اصل ٹپ کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ مثلاً اگر مکانات بناتے تھے تو ایک ترتیب کے ساتھ خصوصاً سیوریج کے مسائل کو پیش نظر رکھ کر۔

میدانی علاقوں کا طرز معاشرت اور طرز تعمیر' پہاڑی علاقوں سے قدرے مختلف نظر آتا ہے یہ منصوبہ بندی کا شعور ہی تھا جس نے آج امریکہ کو دنیا کی واحد سپر طاقت بنا رکھا ہے۔۔۔

اور یہ منصوبہ بندی کا فقدان ہے جس نے ہمیں تحت الثریٰ کی گہرائیاں میں پہنچا دیا ہے اور کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔

سیکرامنٹو میں کیلیفورنیا کے مرکزی دفاتر کی عمارت کی شناخت کے لئے جو گنبد نما عمارت بنائی گئی ہے وہ واشنگٹن ڈی سی سے بالکل ملتی جلتی ہے۔

۲۱۰ فٹ بلند گنبد کی تین منزلیں نمایاں دکھائی دیتی ہیں جو بالکل واشنگٹن ڈی سی کے گنبد کی مماثل دکھائی دیتا ہے۔

اس عمارت میں سیاحوں کے لئے سات تاریخی عجائب گھر موجود ہیں جہاں روزانہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ آتے اور جاتے ہیں-----

امریکنوں نے اگر آج ساری دنیا پر اپنی طاقت اور حکومت کا سکہ جما رکھا ہے۔ تو اس کا سبب صرف دھونس اور دھاندلی ہی نہیں-----

سیاسی ہیرا پھیری پتھر کے زمانے کا انسان بھی کرتا تھا۔ آج کے مہذب انسان نے اسے "ڈپلومیسی" کا نام دے دیا ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ امریکن اپنی ڈپلومیسی کے سہارے ساری دنیا کو سرنگوں کرتے چلے جا رہے ہیں۔

لیکن ------

اس دنیا میں وہ قومیں اور ملک بھی موجود ہیں جنہوں نے اپنی ترجیحات کا تعین بہت پہلے کرکے بڑی کامیابی سے اس ڈپلومیسی کو چاروں شانے چت کیا ہے-----

کیا امریکہ کی یہ خواہش نہیں رہی کہ وہ یورپ پر بھی بادشاہت کرے؟

لیکن ----

دیکھ لیجئے------

یورپین اس کے قابو نہیں آرہے-----

امریکن سسٹم میں بے شمار کیڑے نکالے جا سکتے ہیں۔

لیکن-----

ان کا ایک کریڈٹ کوئی نہیں چھین سکتا کہ امریکن حکومت اپنے عوام کو اپنا حصہ سمجھتی ہے---- پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں سیشن چل رہا ہو تو اس کے دو دو

فرلانگ دور تک کسی چڑیا کو پر مارنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

اسمبلی کی طرف آنے والی سڑکیں بند کر دی جاتی ہیں گورنر بہادر کی سواری گزرنی ہو تو سڑکیں بند کر دی جاتی ہیں۔

وزیراعظم کی تو بات ہی اور ہے۔ وہاں تو گھنٹوں پہلے خلق خدا کو عذاب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ یہ اس کے برعکس امریکہ میں جب بھی عوام چاہیں اپنے حاکموں کو گردن سے پکڑ سکتے ہیں----- جس کا اگلی نشست میں ذکر کروں گا کہ واشنگٹن ڈی سی میں کانگریس اور سینٹر بلڈنگ میں عوام کس طرح دندناتے پھرتے ہیں۔

شاید سی آئی اے یا پنٹاگان ہی دو ایسی عمارات ہوں جہاں سیکورٹی اقدامات کے تحت پابندیاں عائد ہوں ورنہ امریکہ کی کوئی ایسی عمارت یا دفتر ایسا نہیں جو ''شاہراہ عام'' نہ ہو-----

سیکوامٹو کی اس عمارت میں بھی لوگ آسانی سے آجاسکتے ہیں۔

افسوس۔ صد افسوس کہ ہم پیروکار تو ان کے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جو فاروق اعظمؓ تھے۔

جن کو بھرے مجمع میں مسلمان تقریر کرنے سے روک کر ان کے تن پر موجود کپڑوں کا حساب پوچھا کرتے تھے اور اب ہمارے دماغ ایسے بگڑے ہیں کہ اپنی شکلیں تو کیا بگاڑیں اپنے اقدار سے بھی بغاوت کر دی-----

وہ حکمراں جو کاسہ گدائی اٹھا کر امریکی ایوانوں میں اقتدار کی بھیک مانگتے ہیں۔ جب مسند اقتدار پر براجمان ہو جائیں تو خود کو فرعون بنا لیتے ہیں۔

کیا انہیں علم نہیں ہوتا کہ ان کے عوام کو کس عذاب سے دوچار ہونا پڑتا ہے جب ان کی سواری سڑکوں سے گزرتی ہے؟

سوال یہ ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ بات ان کے علم میں نہ رہی ہو----- وہ کوئی آسمانی مخلوق نہیں۔ اسی زمین پر چلنے پھرنے والے انسان ہیں۔ اب یہ الگ بات کہ اقتدار کے نشے میں اندھے ہو کر وہ خود کو ''فرنگی حکمران'' بنا لیں۔

○

۲۸ ایکڑ پر مشتمل "اولڈ سیکرامنٹو" ہی دراصل وہ علاقہ ہے جس کے پانیوں میں کبھی سونا تیرا کرتا تھا۔

زندہ قومیں اپنے ورثے کو سرمایہ حیات سمجھ کر نہ صرف محفوظ رکھتیں ہیں بلکہ اس کی حفاظت کے لئے بھی ہر ممکن اقدامات کرتی ہیں۔ جس کی بہترین مثال پرانے سیکرامنٹو کی حفاظت ہے۔

۲۸ ایکڑ رقبے پر مشتمل یہ علاقہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا آج سے ۱۵۰ سال پہلے تھا۔

یہاں سیکرامنٹو کا پہلا ریلوے سٹیشن' سینما ہاؤس' تھیٹر' میوزیم' سکول' گھر اور دریا میں قدیم جہازوں میں قائم ہوٹل موجود ہیں۔

کیا مجال جو ان پر آلودگی قدرتی یا غیر قدرتی ـــــ کسی بھی طرح اثر انداز ہو سکے۔ کمال کی بات تو یہ ہے کہ "اولڈ سیکرامنٹو" میں جتنی بھی عمارات محفوظ ہیں جن میں ایک شاپنگ مارکیٹ بھی شامل ہے وہ سب ان ہی اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں جو یہاں ابتدا میں استعمال ہوتی رہیں۔

یہ سارا شہر دریائے سیکرامنٹو کے کنارے پر موجود ہےـــــ

○

یہاں آنے والے سیاح اس حصے کی کشادہ گلیاں' سڑکوں پر بنے سائیڈ ورک' اور دریا کے کنارے پر بنی بستی کو دیکھ کر خود کو ۱۹ ویں صدی کا باشندہ محسوس کرتے ہیں۔

اس کے لئے سو بلڈنگیں محفوظ کی گئی ہیں جن میں ایک کمرے کا وہ سکول بھی

شامل ہے جو سیکرامنٹو کا پہلا سکول تھا۔

اس سکول میں جب بھی آپ جائیں کوئی نہ کوئی کلاس چل رہی ہوتی ہے۔

مجھے بھی اس کلاس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔

کلاس روم میں ایک ڈھلتی عمر کی خاتون استانی جس نے مقامی لوگوں کا قدیم لباس پہن رکھا تھا وہاں آنے والوں کو سیکرامنٹو کے اس سکول کی تاریخ بتا رہی تھی۔

اس درمیان آپ کو سوالات کرنے کی اجازت ہے۔

بالکل کلاس روم والا ماحول موجود ہے جیسے کوئی استاد اپنے شاگردوں کو پڑھا رہا پھر اسی طرح پہلا پوسٹ آفس اور پہلا امتحانی کمرہ بھی جوں کا توں موجود ہے۔

ان کے علاوہ اس شہر بے مثال میں اس دور کے مکانات' ہوٹل' کافی ہاؤس' آئس کریم پارلر' بوتیک اور گفٹ شاپس بھی موجود ہیں۔

ان میں سامان زندگی تو نیا ہے لیکن عمارات پرانی ہیں اور ان کی بقا کا راز بھی شاید اس میں ہے کہ یہ پرانی عمارات چونکہ زیر استعمال ہیں اس لئے ان کی آرائش و زیبائش برقرار رہتی ہے۔

اس تجربے سے ہمارے آثار قدیمہ کو فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ہم تو خدا کے فضل سے پرانی عمارات کو یہ جان کر اثار قدیمہ بناتے ہیں کہ ایک روز یہ خود ہی تباہ ہو کر نیست و نابود ہو جائیں گی اور ہماری جان چھٹے گی ----

آپ لاہور کے شاہی قلعہ میں جائیں وہاں زیر زمین سرنگ کو بند کر دیا گیا ہے ---میں نے متعلقہ اتھارٹیز سے ان کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے گوہر فشانی فرمائی۔

ایسا ان تاریخی عمارات کی حفاظت کے لئے کیا گیا ہے۔

بے اختیار سر پیٹ لینے کو جی چاہا کہ عالی جاہ! جب ان کی صفائی نہیں ہو گی' ہوا کی آمدورفت کے راستے نہیں ہوں گے' مرمت جاری نہیں رہے گی تو یہ عمارات

آہستہ آہستہ تباہ ہو جائیں گی یا محفوظ ہوتی جائیں گی؟

شاید اب ہمارا تاریخی اثاثہ صرف تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہو جائے گا اور ہمارا محکمہ آثار قدیمہ بڑی سرگرمی بلکہ تن من اور دھن سے اس منصوبے پر عمل پیرا ہے۔

ع اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی

۱۸۴۹ء میں تعمیر ہونے والا اولڈ ریگل تھیٹر جو یہاں موجود ہے کیلے فورنیا کا قدیم ترین تھیٹر ہے جہاں آج بھی روزانہ ڈرامے' تماثیل اور پروگرام دکھائے جاتے ہیں اور شائقین کے لئے ۱۸۴۹ کا ماحول پیدا کر کے انہیں آج کا ڈرامہ دکھایا جا رہا ہے۔

۱۸۷۶ء میں قائم ہونے والا سنٹرل پیسفک پیسنجر سٹیشن جوں کا توں اپنی جگہ کھڑا ہے اور یہاں وہ ٹرینیں بھی موجود ہیں جو تب چلائی جاتی تھیں اور آج تک چلائی جا رہی ہیں انہیں امریکی اپنی زبان میں پسنجر کار کہتے ہیں۔

اس حصے میں کیلے فورنیا سٹیٹ ریل روڈ میوزیم بھی موجود ہے ـــــــ!

یہاں ۲۱ قدیم ترین ریلوے انجن اور بوگیاں مکمل اور محفوظ حالت میں موجود ہیں اور اس لحاظ سے شاید دنیا کا یہ سب سے بڑا ریل میوزیم شمار ہو گا۔

سٹیم انجنوں کے ۴۲۹۴ نمونے یہاں موجود ہیں جو کروڑوں ڈالر مالیت کے ہیں اور شاید ہزاروں ڈالر سالانہ ان پر خرچ بھی اٹھتا ہے۔

یہاں کیلے فورنیا کی قدیم ترین ریل لیوسین بیبز Lucivs beebs اور ۱۸۶۲ء میں تیار ہونے والی "گولڈ کوسٹ" گورنر سٹفرڈ ٹرینیں موجود ہیں ـــــ واقعی دنیا میں ان ہی قوموں کا مستقبل روشن ہے جنہوں نے اپنا ماضی محفوظ رکھا

یاد رکھا'

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسی کی حفاظت بھی کی ـــــــ!

سرخ ... چندی اینٹوں کی ۱۸۵۴ء میں بنی بلڈنگ میں سیکرامنٹو سٹی ہال قائم ہے

جہاں واٹر ورکس کے دفاتر ہیں۔ یہاں ویڈیو پر ہر وقت مختلف تاریخی فلمیں چلتی رہتی ہیں جنہیں دیکھنے سے آپ کو سب کچھ ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

اس سٹی ہال کی ایک خصوصیت ناقابل فراموش ہے کہ آپ جب بھی چاہئیں شہر کی فلاح و بہبود یا مزید بہتری کے لئے ہونے والی کسی بھی بحث میں حصہ لیں۔۔۔۔

اپنی تجاویز پیش کریں۔۔۔۔۔ اور اپنے نیک مشوروں سے نوازیں۔

مزید حیرت کہ یہ سب کچھ کرنے پر آپ کا شکریہ ادا کیا جائے گا اور باقاعدہ لکھ کر تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔۔۔۔

○

اب اندازہ فرمایئے کہ اگر خدانخواستہ کبھی آپ کا دماغ خراب ہو اور آپ اپنے شہر کی کارپوریشن کو کوئی مشورہ دینا چاہئیں تو آپ کا کیا حشر کر دیا جائے گا۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم آپ کو یہ احساس ضرور ہو جائے گا کہ آپ سے زیادہ احمق اور بے وقوف شخص اس شہر میں کوئی نہیں کہ جو اپنی انتظامیہ کے اعلیٰ افسران کو مشورہ دینے چلا ہے۔

۱۸۵۰ء میں چونکہ یہاں سونا تلاش کرنے کی انڈسٹری عروج پر تھی۔ اس زمانے کی بنی "پیڈل بوٹس" دریا میں مستقل لنگر انداز ہیں اور "ڈیلٹا کنگ" نامی ایک بڑا جہاز بھی جس میں اب ریسٹورنٹ بنا دیا گیا ہے محفوظ و مامون کھڑا دعوت نظارا دے رہا ہے۔

پیڈل سے چلنے والی کئی کشتیاں مثلاً "ریورسٹی کوئین" ایلزبتھ لوئیس" وغیرہ آپ کی طفنن طبع کے لئے آج بھی موجود ہیں۔

اب آپ کو شاید دریا میں سونا نہ مل سکے کہ سارا سونا امریکیوں نے نکال لیا

ہے۔

پرانے سیکرامنٹو سے تھوڑے فاصلے پر پندرہ کمروں پر مشتمل "وکٹورین گورنر مشن" بھی اپنی جگہ موجود ہے۔ جہاں کیلیے فورنیا کے ۱۳ گورنر اپنی مسند اقتدار سجا چکے ہیں ان میں امریکہ کے سابق صدر جناب رونلڈ ریگن کا نام بھی شامل ہے-----

موصوف بھی یہاں گورنر رہ چکے ہیں----

اب یہ گورنر ہاؤس "سٹیٹ میوزیم" بن چکا ہے جہاں آپ کو ۱۹ ویں صدی کی اس عظیم الشان عمارت مں اس زمانے کا طرز تعمیراور طرز معاشرت مکمل زندگی کے ساتھ موجود دکھائی پڑے گا۔

۱۸۷۳ء میں قائم ہوئے والا مغربی امریکہ کا قدیم ترین آرٹ میوزیم کروکر آرٹ میوزیم بھی یہاں موجود ہے یہاں موجود یورپین پینٹنگز کے نمونے اور بڑے بڑے آرٹسٹوں کی نایاب ڈرائینگز جن کا تعلق ۱۹ ویں صدی سے تھا اس میوزیم کا امتیاز ہیں۔

اس سے آگے چلئے تو فرنٹ سٹریٹ پر "ٹو دی فورڈ میوزیم" Towe ford ہے اس میوزیم کی انفرادیت یہ ہے کہ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۵۳ء تک فورڈ کمپنی کی تیار کردہ کاروں کے تمام ماڈل یہاں محفوظ ہیں۔

۱۷ ویں سی سٹریٹ پر "الماؤنڈ گرور ایکسچینج" نامی فیکٹری ہے جہاں دنیا کا سب سے بڑا بادام صاف کرنے کا کارخانہ لگایا گیا ہے------

ہم جب امریکہ مین گئے تھے تو اپنے ملک میں ملنے والے باداموں کو ہی دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے۔ امریکہ جا کر احساس ہوا کہ ہم تو باداموں کے نام پر کچھ اور ہی کھاتے رہے ہیں اصل میں بادام تو یہ ہیں ----- بلا مبالغہ ہمارے تین باداموں کے سائز کا ایک بادام اور سارے میٹھے -----!

امریکہ میں کڑوا بادام کم از کم میں نے نہیں کھایا----!

اس پلانٹ میں آپ کو دنیا کی پانچ زبانون میں بنی ایک فلم دکھائی جاتی ہے جس

میں امریکہ میں بادام کی صنعت کا تفصیلی جائزہ۔ بادام کی کاشت سے تیاری تک کے مراحل پر بنی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔

○

سیکرامنٹو کی ایک یادگار تقریب یہاں کا سالانہ بینڈ مظاہرہ ہوتا ہے جسے مقامی لوگ SACRAMENT DIXIELAND JAZZ JUBLIEE کہتے ہیں۔ اس "بینڈ میلے" میں دنیا کے کونے کونے سے سو بہترین بینڈ حصہ لیتے ہیں۔ اور آپ اندازہ کیجئے کہ جب سو مختلف بینڈ اپنی اپنی دھنیں باری باری سنائیں اور بینڈ بھی وہ جو ساری دنیا میں انتخاب ہوں تو وہاں کیا سماں بندھتا ہو گا۔۔۔۔

یہ واقعی ناقابل فراموش تجربہ ہے۔

شاید دنیا میں اس سے بڑا بینڈ میلہ اور کہیں نہیں لگتا۔

دریائے سیکرامنٹو اور دریائے امریکہ سینکڑوں میل لمبے دریا ہیں۔ جن میں جگہ جگہ آپ کو تیرنے، ماہی گیری کرنے اور واٹر سپورٹس کے مواقع میسر آتے ہیں ان کاموں کے لئے یہاں خاص پوائنٹ بھی بنائے گئے ہیں۔۔۔۔۔۔

ان دریاؤں کا پانی کہیں نیلا اور کہیں سفید ۔۔۔۔۔۔ اور کہیں کہیں دونوں کا خوبصورت امتزاج۔۔۔۔

قدرت نے ہمیں کس نعمت سے نہیں نوازا۔۔۔۔

دریا، پہاڑ، سمندر، قدرتی لینڈ سکیپ غرض کون سی ایسی نعمت ہے جو ہمیں حاصل نہیں۔

لیکن ۔۔۔۔۔۔

ہم کس شدت سے کفران نعمت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

ہم نے اپنے، دریاؤں' پہاڑوں' سمندر اور قدرتی مناظر کا حسن اپنی بد زوقی اور بد تہذیبی کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

راوی دریا پر جایئے آپ کو سارے لاہور شہر میں شاید ہی راوی کا کوئی ایسا کنارہ ملے جہاں آپ بیٹھ کر دریا کے قدرتی حسن سے لطف اندوز ہو سکیں۔

جہاں بھی آپ نظر دوڑائیں آپ کو گندگی کے ڈھیر نظر آئیں گے

افسوس اب تو لاہور کی ساری گندگی ایک گھناؤ نے منصوبے کے تحت دریائے راوی میں پھینکی جا رہی ہے۔

ایک امریکنوں کے دریا ہیں میلوں چلتے چلے جایئے۔ کیا مجال جو کہیں کاغذ کا ایک پرزہ بھی آپ کو دکھائی دے۔

91ء میں جب میں امریکہ گیا تو اٹلانٹک سٹی پر سمندر کے ساحل پر خدا جانے کہاں سے ٹیکے لگانے والی خالی سرنجوں کا ایک پیکٹ پانی پر تیرتا یہاں پہنچ گیا-----

یقین جانیئے یہ اس روز کے مقامی ٹی وی اور اخبارات کی اہم خبر تھی۔

باقاعدہ تحقیق و تفتیش ہونے لگی کہ اس غفلت مجرمانہ کا مرتکب آخر کون ہوا ہے؟

میں نے خبر کا فالوپ نہیں کیا۔

میں جانتا ہوں کہ ان لوگوں نے اس غفلت کو جرم سمجھ کر اس کی تفتیش کی ہوگی اور ملزم کو کبھی معاف نہیں کریں گے---------

○

شاید آپ کو علم نہ ہو کہ امریکہ میں ہائی وے پر ایک بورڈ اکثر آپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے گا جس پر لکھا ہوتا ہے۔" لیٹرنگ فائن " یعنی دوران سفر سڑک کے کنارے کچھ پھینکنے کا جرمانہ -------

اور آپ جانتے ہیں یہ کم از کم کتنا جرمانہ ہے -------200 ڈالر

جی ہاں دو سو ڈالر۔ آگر آپ نے دوران سفر کار سے سگریٹ یا کوئی خالی ٹن یا کوئی بھی اور شے باہر پھینکی تو آپ کو راستے کا کوئی نہ کوئی ریڈار اگر چیک کر لے گا اور کسی نہ کسی موڑ پر دھر لیے جائیں گے۔

یہ جرمانہ 400 ڈالر تک بھی ہو سکتا ہے اب اسے پاکستانی روپیوں سے ضرب دے کر دیکھ لیجئے کہ کسی کا دماغ اگر خراب نہ ہو گیا ہو تو وہ ایسی حرکت کبھی نہیں کرے گا

○

دریاؤں کے ساحل ان کے پانیوں کی طرح صاف و شفاف رکھے جاتے ہیں۔ خصوصاً وہ مقامات جہاں عوامی اجتماع ہوتا ہے وہاں اس بات کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔

سیکرامنٹو کا چڑیا گھر بھی اپنی نوعیت کا ایک چڑیا گھر ہے۔ امریکہ میں کوئی بھی ایسا چڑیا گھر نہیں جہاں کسی پرندے یا جانور کو غیر قدرتی ماحول میں رکھا جائے۔

یہاں قریباً 700 مختلف اقسام کے جانور ہیں جن کو کھلی فضا میں رکھا جاتا ہے۔

آپ اپنی کار میں بیٹھ کر ان کا نظارہ قریب سے کیجئے---------- پیدل بھی چلیئے ---- کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ جس ماحول میں بھی کوئی جانور رکھا گیا ہے اس بات کے امکانات نظر نہیں آتے کہ وہ آنے والوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچا سکے۔

یوں بھی ہماری طرح وہ لوگ جانوروں کو زچ نہیں کرتے ------

صرف محبت کرتے ہیں----

ہماری محبت کا اندازہ بھی بڑا جان لیوا ہوتا ہے-----

اول تو خدا کے فضل سے ڈھنگ کے چڑیا گھر ہی دو تین سارے پاکستان میں ہوں گے۔ یہاں بھی جو لوگ جاتے ہیں وہ جانوروں کو چڑانا اپنا فرض منصبی خیال کرتے ہیں اور جانوروں کو اتنا تنگ کرتے ہیں کہ وہ پنجروں میں بند یا چیخنے چلانے لگیں یا پھر ڈر کر

اپنے بل میں واپس چلے جائیں۔

سیکرامنٹو کے چڑیا گھر میں جو جانور رکھے گئے ہیں۔ ان میں آبی جانوروں کے لئے باقاعدہ آئی لینڈ قائم کیے گئے ہیں جبکہ زمینی جانوروں کو ان کا قدرتی ماحول مہیا کیا گیا ہے-----

اس پارک میں فیری ٹیل ٹاؤن بھی موجود ہے۔ یہاں بچوں کو کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔

دکھائی جاتی ہیں۔

6 ایکڑ پر مشتمل کھیل کا میدان ہے کہ یہاں اپنا شوق پورا کر لیجئے

گولف کورس الگ سے بنایا گیا ہے۔

پکنک پوائنٹس ' میوزک سے لطف اندوز ہونے کی جگہیں اور اپنی مرضی کے کھیل کھیلنے کے مواقع آپ کو یہاں حاصل ہیں۔

شہر کے شمال میں 134 سال پرانی وہ نمائش گاہ ہے جہاں سالانہ نمائش لگتی ہے اور امریکہ کے لیبر ڈے سے 18 روز قبل شروع ہونے والی یہ نمائش لیبر ڈے پر ختم ہو جاتی ہے۔

○

اسے آپ ہمارا عوامی میلہ اور میلہ اسپاں و مویشیاں سمجھ لیجئے جہاں دور دور سے کسان اپنے صحت مند جانوروں کے ساتھ شرکت کرتے ہیں------

نیزہ بازی اور گھڑ سواری کے مقابلے ' دیہاتی اور شہری کھیلیں منعقد ہوتی ہیں

قدیم و جدید کا حسین امتزاج سیکرامنٹو کیلئے فورینا کا ایک یاد رہنے والا شہر ہے۔

امریکہ میں سکھوں کی نمائندگی کرنے والا واحد پرچہ "ورلڈ سکھ نیوز" ہے......
جس کا دفتر کیلیفورنیا کے چھوٹے سے شہر "سٹاکٹن" میں ہے۔ سٹاکٹن کی تاریخی اہمیت میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ چونکہ میں بھی اس "ہفت روزہ ورلڈ سکھ نیوز" سے گزشتہ ۳ سال سے وابستہ ہوں اور یہاں ہفتہ وار کالم لکھتا ہوں اس لئے میری حیثیت ایک سٹاف ممبر کی سی ہے۔

ڈاکٹر گورندر سنگھ گریوال جو سنٹرل ویلی کے چھوٹے سے ٹاؤن "ٹریسی" میں پریکٹس کرتے ہیں اس علاقے کے واحد ماہر امراض دل ہیں جنہیں میڈیکل کی زبان میں "کارڈیک سرجن" کہا جاتا ہے۔

ایک سرجن امریکہ میں کتنا مصروف ہوتا ہے یا یوں کہہ لیجئے اسے خود کو مصروف رکھنا پڑتا ہے اس کا تصور شاید آپ نہ کر سکیں۔ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس نے امریکہ میں ڈاکٹروں کو کام کرتے دیکھا ہے۔

حیرت ہے کہ اس کے باوجود ڈاکٹر گریوال اپنے رسالے ڈبلیو ایس نیوز کے ایڈیٹر بھی ہیں۔

وہ باقاعدگی سے روزانہ ایک گھنٹہ پرچے کے لئے وقف کرتے ہیں اور ٹریسی سے سٹاکٹس آدھ گھنٹے کی ڈرائیو کر کے آئے اور پھر واپس جاتے ہیں۔ دریں اثنا بھی وہ پرچے سے "ان ٹچ" رہتے ہیں اور کوئی بھی قباحت پیش آنے کی صورت میں انہیں فون کر کے ان سے مشورہ لیا جاتا ہے۔

اندر جیت سنگھ پرچے کے پنجابی (گورمکھی) حصے کے اور سردار ڈھنڈسا انگریزی حصے کے انچارج ہیں۔

دونوں نوجوان اور انرجیٹک" ہیں۔

اندرجیت نے باقاعدہ صحافت امریکہ میں ہی شروع کی تھی اور اب باقاعدہ صحافی بن چکے ہیں۔ گوکہ انہیں امریکہ میں اتنی زیادہ مشینی سہولتیں حاصل ہیں کہ ان کا کام خاصا آسان ہو جاتا ہے۔

ان مشینوں کو آپریٹ کرنا بھی ایک مسئلہ ہے۔

اندر جیت نے ٹائپ کرنا یہاں سیکھا تھا اور اب انہیں اس پر کمال حاصل ہے۔ دنیا کے کونے کونے سے دفتر میں جمع ہونے والی خبروں کی "سب ایڈیٹنگ" کرنا ان کی سرخیاں نکالنا اور ان کی پیسٹنگ کروانا ان کی ذمہ داری ہے جو خاصا مشکل کام ہے۔ لیکن امریکہ میں کوئی کام مشکل نہیں ہوتا۔

یہاں آپ یا تو کام کرتے ہیں یا نہیں کرتے----

یہ مشکل آسان والی ٹرمنالوجی یہاں نہیں چلتی۔ امریکہ میں چونکہ مرفی (MURPHY LAW) جس کا بنیادی اصول "ہائر اینڈ فائر" ہے اس لئے ورکر اور مالک دونوں کو اپنی اوقات یاد رہتی ہے۔ میں نے اکثر دفاتر میں ایک پوسٹر ٹکٹ دیکھا ہے جس پر لکھا ہوتا ہے۔

اصولی نمبر ایک باس از آل ویز رائیٹ (مالک ہمیشہ صحیح ہوتا ہے) اصول نمبر دو۔ اف باس از رانگ (اگر مالک غلط ہے) اصول نمبر تین۔ سی اگین رول نمبرون (پھر آپ دوبارہ اصول نمبر ایک دیکھیں) یعنی باس اگر غلط بھی ہے تو بھی صحیح ہے----! کیسا عجیب اور بسا اوقات پریشان کر دینے والا اصول ہے پہلے پہل تو امریکہ میں آکر انسان حیران ہی رہ جاتا ہے کہ ایسے آزاد اور جمہوری معاشرے میں مزدورون کے حقوق کیا ہیں؟ مالک کے کیا ہیں؟۔

ہمارے پاس تو ذرا جمہوریت آئے اور تالا بندی کا حق ملے تو ادھے ملک کی

فیکٹریوں کو تالے لگ جاتے ہیں۔ کم از کم یونین سازی کو آئینی حیثیت تو یہاں حاصل ہے لیکن امریکہ میں ایسا نہیں۔

امریکہ میں مزدور یونینز ضرور ہیں لیکن مالکوں کو کسی بھی ملازم کو کوئی وجہ بتائے بغیر نوٹس دیئے بغیر کان سے پکڑ کر نکال دینے کا حق بھی حاصل ہے اور اس سلسلے میں یونین مالکان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

یونین زیادہ یہی کر سکتی ہے کہ حکومت کی طرف سے جو مراعات ملازمین کو حاصل ہیں انہیں یقینی بنائے۔

○

ڈھنڈسا آج کل ڈبلیو ایس نیوز کے انگریزی سیکشن کا انچارج ہے اس سے پہلے بھارت میں تین چار انگریزی اخبارات مین کام کر چکا ہے۔ بلا کا محنتی اور ذہین نوجوان۔ اس پرچے میں کام کرنے کا مطلب تلوار کی دھار پر چلنا ہے

کیونکہ یہ پرچہ خالصتان نواز سکھوں کا نمائندہ پرچہ تسلیم کیا جاتا ہے اور امریکہ میں ایک ہی ایسا پرچہ ہے جو بھارتی حکومت کی اچھی طرح خبرلیتا ہے اس لئے بھارتی حکومت کی اس پر خاص نظر ہوتی ہے۔

یہاں ایک اور بات میں گوش گزار کرتا چلوں کہ بھارتی حکومت کے بیرون ملک سفارتخانوں کو اپنے ملک جیسا نہ سمجھ لیجئے۔

ہمارے سفارتکار چونکہ خود کو ''رومن دور'' کے ایلچی سمجھتے ہیں اس لئے اسی ٹھاٹھ باٹ سے رہتے ہیں۔

پاکستان سے باہر ہمارے سفارتکاروں کا (چند مثالی شخصیتوں کو نکال کر) صرف ایک کام ہے کہ اپنے ملک کے غریب الوطن لوگوں کو اپنے ہونے کا احساس دلاتے رہیں----۔

معمولی کاموں کے لئے تکلیف دہ انتظار کروانا ------

غلط شہرت رکھنے والے پاکستانیوں کے ہاتھوں میں آلہ کار بنے رہنا --------۔

پاکستان کی بہتری کے لئے سوچنے' کرنے ' یا ''کچھ کرنے کی کوشش کرنے''۔ الوا
کو اتنا پریشان کرنا کہ وہ تنگ آکر اپنا ارادہ ہی بدل دیں ہمارے سفارتکاروں کے وہ
سنہری کارنامے ہیں جن پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے

امریکہ اور یورپ میں سربراہان مملکت سے ملاقات تو ممکن ہے----- لیکن

ہمارے سفیر یا ہائی کمشنر صاحبان ------ توبہ کیجئے صاحب توبہ کیجئے------

اس ضمن میں یوں تو مبالغہ آرائی کی بہت گنجائش ہے لیکن ایک بات تو بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ پہلی ملاقات میں آپ کو ان اعلیٰ و ارفع ہستیوں کا دیدار نصیب ہو جائے۔

ہاں!

ایک صورت ہے۔

اگر آپ کا تعلق پاکستان میں برسراقتدار ٹولے سے ہے آپ اس پوزیشن میں ہیں کہ متعلقہ صاحب کو کوئی نقصان پہنچا سکیں تو آپ ان کے ''حسن سلوک'' کے بہر صورت مستحق ہیں۔

اس کے برعکس بھارتی سفارتکار بہت ''ایکٹو'' اور ''سمارٹ'' ------- خصوصاً جب سے بھارت میں آزادی پسند تحریکوں نے زور پکڑا ہے یہ لوگ زیادہ چوکنے ہو گئے ہیں---- مثلاً سکھوں کی مثال ہی لے لیجئے۔

اگر کیلے فورنیا کی بات کریں تو یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ اس ریاست میں خالصتان نواز سکھوں کی مکمل فہرست سان فرانسسکو میں بھارتی کونسل کے پاس محفوظ ہے نہ صرف یہ بلکہ یہاں کے ہر قابل ذکر گوردوارے میں ان کا عمل

شل ہے ---- ان کی لابی موجود ہے---- اور خالصتان نواز سکھوں کو ہر وقت اس سے چوکنا رہنا پڑتا ہے۔

سان فرانسکو کے بھارتی قونصلیٹ کو اس بات کی بھی خبر رہتی ہے کہ اس مرتبہ مظاہرے میں کون کون حصہ لے رہا ہے؟

سکھوں کا پروگرام کیا ہے؟

ان کے ارادے کیا ہیں؟

یہیں تک نہیں بلکہ بھارتی سفارت خانے ایک طرح سے اپنے ملک کی انٹیلی جنس کے فرائض انجام دے رہے ہیں ہر وقت یہ لوگ جوڑ توڑ میں مصروف رہے ہیں۔

جس ملک میں بھی رہیں وہاں کے پریس اور پولیس سے خصوصی تعلقات قائم کرتے ہیں خصوصاً میڈیا میں اپنے اثر و رسوخ سے مخالفین کے خلاف پراپگنڈا جاری رکھتے ہیں۔ امریکہ' کینیڈا اور لندن میں تو بھارتی سفارت کاروں نے فلموں' لٹریچر کے ذریعے باقاعدہ پراپیگنڈا مہم جاری رکھی ہے۔

اسی طرح کشمیر کا مسئلہ لیجئے----

کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۹۰ اور ۹۱ء کے سال نکال کر ہمارے سفارتکاروں نے کبھی اس محاذ پر کام کرنے کی زحمت گوارہ کی ہو۔

اس کے برعکس بھارتی سفارت کاروں کو لیجئے۔

قیام پاکستان کے بعد سے آج تک شاید ہی انہوں نے یہ محاذ خالی چھوڑا ہو میں بات ورلڈ سکھ نیوز کی کر رہا تھا کہ یہ پرچہ چونکہ بھارت مخالف لابی کی نمائندگی کرتا ہے اس لئے بھارتی حکومت کی اس پر خصوصی نظر رہتی ہے۔ ایک مرتبہ اس پرچے سے منسلک ہونے کا مطلب ہے کہ اب بھارت میں داخلے کے دروازے بند ہو گئے۔

بھارتی حکومت یہاں کام کرنے والوں کو اپنا دشمن نمبرایک سمجھتی ہے۔ اس لئے اس پرچے سے کسی بھی بھارتی شہری کی وابستگی بڑے دل گردے کا کام ہے۔

اندرجیت اور ڈھنڈ سانے میرے ساتھ سٹاکٹن سے سیکرامنٹو جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ واپسی پر ہم سٹاکٹن سے کچھ فاصلے پر دائیں ہاتھ دریا کی طرف مڑ گئے۔

اس جگہ کا نام "ریووسٹا" RIO VISTA ہے--------

دریا کنارے موجود اس چھوٹے سے ٹاؤن میں انسانی عقل کو ورطہ حیرت میں ڈالنے والا FOSTER,S BIGHRON سپورٹس مین ہیڈ کوارٹر موجود ہے۔

جنگلی جانوروں کے سروں والا عظیم الشان حنوط گھر ولیم بل فوسٹر نے جو امریکہ کا شہرہ آفاق شکاری تھا ۱۹۳۱ء میں قائم کیا-----

فوسٹر یہاں ایسا حنوط گھر بنانا چاہتا تھا جہاں وہ دنیا کے تمام جنگلی جانوروں کے سر اکٹھے کر سکے اور یہ حنوط گھر پھر دنیا بھر میں ایک عجوبہ شمار ہونے لگے------

اس گمنام اور ہائی وے سے بالکل الگ تھلگ راستے پر واقع چھوٹے سے ٹاؤن کو فوسٹر اتنی شہرت دینے میں کامیاب ہو گیا کہ پھر دنیا کے کونے کونے سے سیاح اس کا حنوط گھر دیکھنے آنے لگے-----

فوسٹر کیلے فورنیا کے ایک ٹاؤن "ہاورڈ" میں پیدا ہوا اور وہ جو کہتے ہیں کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات -----نو عمری ہی میں اسے شکار کا جنون کی حد تک شوق تھا۔

۱۹۱۸ء میں کیلے فورنیا مین "نیوارک" کے مقام پر اپنی جوانی افریقہ کے جنگلوں کی بھینٹ چڑھانے والے پہلے امریکی نژاد شکاری ہنری سنو نے بعد میں یہاں اپنی فونڈری قائم کر لی تھی۔ فوسٹر اس کے پاس بطور اپیرنٹس ٹریننگ حاصل کر رہا تھا "ہنری سنو" کے ذریعے امریکیوں کو پہلی مرتبہ افریقہ کی جنگلی حیات کی تصاویر اور فلمیں دیکھنے کا موقعہ ملا۔

نوجوان فوسٹر کو ہنری سنو کی شخصیت نے بہت متاثر کیا اور اس نے بھی افریقہ جانے اور وہاں شکار کرنے کی ٹھانی۔

۱۹۱۹ء میں نوجوان فوسٹر نے افریقہ کی طرف جانے والے ایک بادبانی جہاز میں سفر کیا اس مرتبہ وہ صرف اس تاریک اور پراسرار براعظم کے پوشیدہ اسرار سمجھنے کے لئے ایک سیاح کی حیثیت سے گیا اور واپس لوٹ آیا۔

نو سال تک پھر اس نے جان توڑ محنت کی ۔ زاد راہ اکٹھا کیا۔ مختلف قسم کی شکاری بندوقیں اور دیگر ساز و سامان تیار کیا اور ۱۹۲۸ء میں جہاں نوردی کی نیت سے افریقہ کی راہ لی۔ یہ اس کی زندگی کا طویل ترین سفر تھا جس میں اس نے دنیا کے متعدد براعظموں کی سیر کی۔ وہاں شکار کھیلا اور اپنے شکار کا لوہا بھی منوایا۔

وہ کئی کئی مہینے دنیا کے مختلف حصوں میں شکار کھیلتا۔ وہاں جنگلی جانوروں کو مارتا اور ان کے سر اور کھالیں یہاں ''ریووسٹا'' میں جمع کرتا رہا۔ اس کا یہ شوق جنون کی حدوں کو چھونے لگا تھا۔

آج ''بگ ہارن'' دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد جانوروں کے حنوط شدہ سروں کا گھر ہے۔ دنیا کے کونے کونے میں پائے جانے والے ۳۰۰ سے زائد جنگلی جانوروں پرندوں مچھلیوں کے سر یہاں دیواروں میں سجے دنیا کے کونے کونے سے آنے والوں کو دعوت نظارہ دیتے ہیں۔

بہت سی دیگر حیران کن چیزوں کے علاوہ یہاں افریقہ کے ہاتھیوں کے مکمل سر موجود ہیں ۔ تیرہ فٹ لمبے چیتے کی کھال دیوار میں نصب ہے اور ۱۱۰ پونڈ وزن کے ہاتھی دانت بھی یہیں سجائے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک کی لمبائی ۵ فٹ ہے۔۔

یہ دانت ان ہاتھیوں کے ہوں گے جن کے سر دیوار میں نصب ہیں اور ان سروں کے دائیں بائیں یہ دانت لٹک رہے ہیں۔

یہاں کی ایک خصوصیت جو اس ''بگ ہارن'' کو ساری دنیا میں ممتاز کرتی ہے۔ دنیا کے سب سے لمبے جانور GIRAFFE کا سر ہے ساری دنیا میں شاید ایک درجن اس نوعیت کے سر نہیں ہوں گے۔

موس MOOSE بھی امریکہ میں پایا جانے والا ایک بڑے بڑے سینگوں والا ہرن نما جانور ہے۔ جس کی اونچائی قریباً ساڑھے پانچ فٹ ہوتی ہے۔ یہاں موس کا ایک ڈھانچہ ایسا رکھا ہے جس کی لمبائی ۷۶ انچ ہے اور فوسٹر کا دعویٰ تھا کہ دنیا میں اس سے زیادہ لمبائی والا موس موجود نہیں ہے۔

آج تک اس کا یہ دعویٰ باطل نہیں ہو سکا--------!!

تاریخ میں یوں تو بہت سے حوالوں سے بہت سے انسانوں کو ممتاز مقام حاصل ہے لیکن---!

ایک امتیاز جو اس عظیم شکاری کو حاصل رہا وہ ناقابل چیلنج ہے -----

یہ "موس" جو ۷۶ انچ لمبا ہے ۱۹۱۲ء میں لاس اینجلس میں کسی اور شکاری نے شکار کیا تھا اور فوسٹر نے یہ بات بطور خاص اس کے ساتھ لکھ دی ہے------

خیال رہے کہ امریکہ اور یورپ کے جس میوزیم چڑیا گھر وغیرہ میں آپ جائیں گے وہاں جو بھی چیز رکھی ہوگی اس کے ساتھ اس کا مکمل تاریخ جغرافیہ بھی موجود ہوگا۔

عموماً بڑے میوزیم میں ہر جانور' مشینری یا نوادرات کے نزدیک ایک پش بٹن ہوتا ہے جسے آپ دبائیں گے تو فوراً ٹیپ آن ہو جاتی ہے اور اس سے متعلق تمام تر معلومات آپ کو سنائی جاتی ہیں

کئی جگہ بٹن دبانے پر وڈیو فلم چلنے لگتی ہے اور متعلقہ شے کا مکمل تعارف پیش کیا جاتا ہے

○

خیر! بات ہو رہی تھی جناب فوسٹر کی پیشہ وارانہ ایمانداری کی کہ موصوف اگر یہ کہہ

دیتے کہ اس "موس" کو مارنے کا اعزاز بھی انہیں ہی حاصل ہے تو بھی کسی کی جرات نہیں تھی کہ ان کی طرف انگلی اٹھاتا۔

انہوں نے اس تاریخی بے ایمانی سے اجتناب برتا۔ اور آج شکاریات کی تاریخ میں ان کا نام سنہری حروف سے رقم ہے۔

ایک ہمارے شکاری صاحبان ہیں کہ اخبارات میں اپنے نام اور تصاویر چھپوانے کے لئے ایسے ایسے من گھڑت افسانے تراشتے ہیں کہ خدا کی پناہ ------!!

اگر شکاری صاحب نے کبھی جوانی کے دنوں میں کوئی گیدڑ شکار کیا تھا تو بڑھاپے تک وہ چیتا بن چکا ہوتا ہے ----

افسوس ہم تاریخ کو بھی محض اپنی بے جاخواہشوں اور اپنے اندر موجود حیوانیت کی بھینٹ چڑھانے سے نہیں چوکتے اور مسخ کرتے چلے جاتے ہیں-----

خدا جانے جب آئندہ نسلیں ہمارے کارنامے پڑھا کریں گی تو وہ ہمارے اصلی اور واقعی کاناموں کو بھی "اون" کریں گی یا انہیں بھی فراڈ اور فریب جان کر نظرانداز کردیں گی؟

ہاتھی کے علاوہ جن اور جانوروں کے سر یہاں نمایاں نظر آتے ہیں ان میں ایک درجن کے قریب مختلف النسل ہرن اور بارہ سنگھے گینڈے' رینو سارس' شیر' چیتے' برفانی اور جنگلی ریچھ اور جنگلی گائے شامل ہیں اور ان میں سے ۹۵ فی صد سے زیادہ فوسٹر نے خود شکار کئے تھے۔

ولیم فوسٹر نے شکار زیادہ تر افریقہ' ہندوستان' گرین لینڈ' الاسکا' میکسیکو اور امریکہ میں کھیلا۔

۲۵ سال پہلے ان جنگلی جانوروں کے سروں کو حنوط کرنے پر جو خرچ اٹھا تھا وہ اس طرح ہے۔

ہاتھی کے سر پر چار ہزار ڈالر----

GIRAFFE آٹھ سو ڈالر----

گینڈے پر چار سو پچاس ڈالر-----

رینوسارس پر ساڑھے تین سو ڈالر-----

افراط زر دنیا میں جس طرح بڑھا ہے اس سے اندازہ لگائیے کہ آج اس کی اہمیت کیا ہوگی۔

شاید ہمارے تصور سے بھی زیادہ

ولیم فوسٹر نے اپنی زندگی میں دنیا کے نامور شکاریوں سے دنیا کے مختلف حصوں میں ملاقاتیں کیں اور ان کے ساتھ مل کر شکار کھیلا۔

اپنی زندگی کے پہلے شکاری سفر کے دوران افریقہ میں اس کی ملاقات شہرہ آفاق مصنف اور شکاری ارنسٹ ہمینگونیے سے بھی ہوئی۔ فوسٹر کا کہنا ہے کہ تب ہمینگوئے ایک نو عمر لڑکا تھا۔

فوسٹر کی سینکڑوں تصاویر مکمل تفصیلات کے ساتھ اس "بگ ہارن" کی دیواروں پر نصب ہیں۔

۱۹۶۳ء میں فوسٹر نے اس جہان فانی کو خیرباد کہا۔ ۱۲ سال بعد دنیا میں اس کی واحد ساتھی اس کی بیوی بھی انتقال کر گئی۔

فوسٹر کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

آج اس عظیم حنوط گھر کو شاندار ہوٹل ریسٹورینٹ کی شکل حاصل ہے اور ریوو ٹسا کی ۱۴۳ مین سٹریٹ پر واقع یہ عجوبہ روزگار اب ٹونی' ڈورتھی براؤن اور ان کے بیٹے جان میکاڈو کے زیر کنٹرول ہے جہاں امریکہ کا بہترین کھانا اور شرابیں میسر ہیں۔

عظیم فوسٹر کی اس عظیم یادگار کو موجودہ مالکان نے مزید چار چاند لگائے ہیں۔ میں جب دونوں دوستوں کے ساتھ اس عظیم الشان عمارت میں داخل ہوا تو دیواروں پر نصب سینکڑوں جانوروں کے سر دیکھ کر دنگ رہ گیا----!!

اندر داخل ہوتے ہی ہمارا استقبال یہاں کی روایت کے مطابق مسز ڈور تھی نے کہا۔

بار روم کی لمبی میز کے ساتھ منسلک آرام دہ سیٹوں پر اپنے سامنے بیئر اور شراب کے جام سجائے ہم سے پہلے درجنوں لوگ یہاں موجود تھے۔ مسز ڈور تھی خود ساقی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

ہماری خصوصی فرمائش پر اس نے ہمیں تازہ پھلوں کا شیک بنا دیا ملک شیک کے یہ جام اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہم ہال نما کمروں میں گھومتے اور جانوروں کے حنوط شدہ سروں کے ساتھ اپنی تصاویر بناتے رہے۔ کہ ہم یہی کر سکتے تھے۔ یہاں کے ماحول میں ولیم کاربٹ کی کہانیوں والا تحیر اور اسرار موجود ہے۔

مدہم روشنی میں جانوروں کے حنوط کردہ سر' مختلف قسم کی شرابوں کی مہک نے ماحول کو خاصا مختلف بنا دیا تھا۔ خصوصی احتیاط کے پیش نظر سگریٹ پینے کی اجازت نہیں----!!

امریکہ کے باقی مقامات کے برعکس یہاں ہفتہ اتوار کے بجائے منگل کی چھٹی ہوتی ہے---

یہ روایت بھی شاید ولیم فوسٹر نے قائم کی تھی جسے ولیم کی روایتوں کے امین اسی اس طرح نبھا رہے ہیں۔

شام ڈھلنے پر جب ہم یہاں سے نکلے تو ریووسٹا سے سٹاکٹسن کی طرف جانے والی سڑک سنسان اور سوچ میں ڈوبی دکھائی دے رہی تھی----

سورج ابھی مکمل غروب نہیں ہوا تھا----

ماحول پر اسرار کی تہہ گہری ہو رہی تھی----

سڑک کے دو رویہ میلوں تک پھیلے کھیتوں میں لہلہاتی فصلیں دیکھ کر رشک آ رہا تھا۔

کاش میری وطن کے کھیت بھی اسی طرح اپنے مکمل پن کے ساتھ لہرانے لگیں

-----!

سیم و تھور اور ہماری بدنیتی کی وجہ سے بانجھ ہوئی ہماری دھرتی پھر سے ہریالی اگنے لگے ------!!

کاش ------!!

ستاکٹسن واپس لوٹے تو رات اترنے لگی تھی -----!!

رات دیر گئے تک اندرجیت مجھے "ریووسٹا" اور ولیم فوسٹر سے متعلق کہانیاں سناتا رہا-----

امریکہ اور نیویارک کے بارے میں ذہن میں کئی ایک تصویریں تھیں ایک تو یہ کہ امریکہ دنیا کی سب سے اہم جمہوری اور معاشی قوت ہے اور اس نے دنیا میں جمہوری اقدار کے فروغ کے لئے ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ امریکہ ایک سپر طاقت ہونے کے ناطے میں امریکہ اور امریکی باشندوں سے خاصا متاثر تھا لیکن ذہن میں امریکہ کے بارے میں جو تصویر تھی وہ ساری محض تخیل کی پیداوار تھی نیوریارک میں کچھ عرصہ رہ کر امریکہ کی جو تصویر میں نے دیکھی اور محسوس کی وہ بڑی بھیانک ہے۔

نیویارک میں دو ماہ میں ۲۰ سے زائد ٹیکسی ڈرائیوروں کو چند ڈالروں کی خاطر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا یہاں انسانی جان کی قیمت نہ ہونے کے برابر ہے اور چند ڈالروں کی خاطر انسان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ نیویارک میں اپنے قیام کے دوران میں نے سڑک پر ایک پاکستانی نیوز ایجنٹ سے بس میں جانے کے لئے دس ڈالر کی چینج لی۔ میں رقم گن رہا تھا تو نیوز ایجنٹ نے جو پاکستانی تھا مجھے نصیحت کی کہ حضور رقم جیب میں ڈالیں ورنہ رقم تو جائے گی ہی جان سے بھی جاؤ گے یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں لوگ اپنے پاس کیش نہیں رکھتے۔ مختلف قسم کے "کارڈز" سے کام چلاتے ہیں۔

امریکہ میں ہر شخص کو اپنے کام کا معقول معاوضہ ملتا ہے ایک گھنٹہ کام کی مزدوری پانچ ڈالر سے کم نہیں اس کے باوجود امریکہ کی سماجی زندگی میں بڑھتے ہوئے جرائم دیکھ کر جمہوریت کے مستقبل سے انسان مایوس ہو جاتا ہے۔ امریکہ میں ہر طرح کی آزادی ہے لیکن اس کے باوجود امریکی تہذیب اور معاشرت جرائم کی طرف

جس تیزی سے بڑھ رہی ہے وہ یقیناً میرے لئے ایک سوالیہ نشان تھا امریکی ٹیلیویژن کا رویہ بھی اسی طرح کا ہے آدھ گھنٹہ کی خبروں میں پہلے بیس منٹ کی خبریں جرائم اور عدالتوں کے اردگرد گھومتی نظر آتی ہیں اور باقی پانچ منٹ بین الاقوامی خبروں کے لئے ہیں اور خبروں کی ترجیح میں انٹرنیشنل حالات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔ لندن اور نیویارک میں زیر زمین ٹرین کے ذریعے سفر کا اتفاق ہوا لندن اور پیرس کا زیر زمین نظام انتہائی صاف ستھرا ہے اور زیر زمین سفر کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن نیویارک کا زیر زمین نظام جسے سب وے(SUB WAY) کہتے ہیں انتہائی گندہ ہے اور اس نظام میں سفر کرتے ہوئے بدبو اور گھٹن کا احساس ہمیشہ رہتا ہے۔

○

شام کو "مانے" کے ساتھ میں اس کے گھر کے قریب ساحل سمندر پر چلا گیا اس علاقے کو" براہٹن بیچ" کہتے ہیں۔ ویک اینڈ ہونے کی وجہ سے لوگوں کی اکثریت ساحل سمندر پر موجود تھی۔ ہم کافی دیر تک ساحل سمندر پر چہل قدمی کرتے رہے۔ اوز سمندر کے ساتھ وہاں موجود لوگوں کا مشاہدہ کرتے رہے۔ ساحل سمندر پر موجود ہر شخص دنیا کو بھول کر صرف اسی ایک لمحے کے لئے جی رہا تھا یوں لگ رہا تھا کہ وہ لوگ زندگی کے اس لمحے کو آخری لمحہ سمجھ کر اس سے پورا پورا لطف اٹھانے میں کوشاں ہیں۔

ان لوگوں کا زندگی کا اپنا فلسفہ ہے ہم اپنے لئے نہیں بلکہ ساری زندگی دوسروں کے لئے جیتے ہیں۔ کبھی اولاد کے لئے کبھی بھائیوں کے لئے کبھی ماں باپ کے لئے لیکن ہمارے سماج اور سوسائٹی میں عدم تحفظ اور سوشل سیکورٹی نہ ہونے کی وجہ سے ہم ہمیشہ آنے والے لمحے کے بارے میں فکر مند رہتے ہیں اور گزرنے والے لمحے کو

بھول جاتے ہیں جبکہ مغرب میں لوگ صرف آج کے لئے جیتے ہیں انہوں نے کل کا انتظار کبھی نہیں کیا اور کل کے بارے میں سوچ کر اپنی صحت خراب نہیں کرتے خاص طور پر ویک اینڈ پر تو یہ کبھی نہیں سوچتے۔

ہمارے ہاں ہفتہ وار چھٹی کو اہل خانہ گھر کا سودا سلف لانے اور جمعہ بازار کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں جبکہ مغرب کے لوگ ہفتہ اتوار کو چھٹی کے دو روز گھر میں نہیں رہتے !ذر گھر سے باہر سیر کے لئے نکل جاتے ہیں۔

سارا ہفتہ ویک اینڈ کی پلاننگ کرتے ہیں۔ ساحل سمندر پر آدھے ننگے مردوں اور عورتوں کے اس جنگل سے میرا دل جلد ہی اکتا گیا۔ (بعد میں تو اس کی جیسے عادت سی ہو گئی تھی) اپنے میزبان کے ہمراہ براہٹن بیچ پر واقع مچھلیوں کا چڑیا گھر دیکھنے گئے۔ اس کا نام AQUARIUM ہے یہاں دنیا بھر کی ہمہ قسم مچھلیاں موجود ہیں اس کے علاوہ ایک گھنٹے کا مچھلیوں کا سرکس تماشہ بھی دکھایا جاتا ہے۔ اور مچھلیاں انسانوں کی طرح مختلف قسم کی بازی گری کے کمالات دکھاتی ہیں جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ان مچھلیوں کو انتہائی مہارت کے ساتھ سھایا گیا ہے ایک مچھلی کا وزن ۱۳۰۰ پونڈ ہے لیکن وہ اپنے کرتبوں سے تماشیوں کو محو حیرت کر دیتی ہے۔ ساحل سمندر گھومتے اور پھرAQUARIUM میں جانے کی وجہ سے ٹانگوں میں مزید گھومنے کی سکت نہیں تھی اس لئے شام ڈھلے گھر واپس لوٹ آئے

اگلے دن نیویارک میں واقع امریکن نیچرل ہسٹری کے میوزیم دیکھنے گئے نیو یارک میں سٹریٹ ۸۱ کے انڈر گراؤنڈ سب وے سٹیشن کے بالکل اوپر یہ عجائب گھر واقع ہے۔ اس عجائب گھر میں انسان ۔ زمین نباتات اور حیوانات کی ترقی کے مختلف مدارج کی خوبصورت تصویریں موجود ہیں۔ چوتھے فلور پر انسانی زندگی کے ابتداء کے لاکھوں سال پرانے دیوہیکل جانوروں کے جسموں کے ڈھانچے موجود ہیں۔ یہ جانور ۴۰ فٹ تک بلند ہیں۔ اور تقریباً ۸۰ فٹ تک لمبے ہیں۔ اور ان ڈھانچوں کو دیکھ کر زمین کی ابتدائی مخلوق کے بارے میں ابتدائی تصویر بڑی واضح ہو جاتی ہے۔

اس عجائب گھر میں ایشیا۔ افریقہ۔ امریکہ اور آسٹریلیا کی قدیم تہذیبوں کی قدیم اور ابتدائی تصویریں موجود ہیں۔ لیکن اس عجائب گھر میں رکھی ہوئی کئی اشیاء کو دیکھ کر یہ احساس ہوا کہ آج جن اشیاء کو امریکیوں نے عجائب گھروں کی زینت بنا لیا ہے ہم ابھی تک پاکستان کے دیہاتوں میں اس طرح کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہماری زراعت ابھی تک عجائب گھر میں رکھے ہوئے ہلوں کی مدد سے کی جارہی ہے۔ ہماری آبپاشی ابھی تک عجائب گھر میں رکھے ہوئے ماڈل کنویں سے کی جا رہی ہے۔

میوزیم میں امریکہ کی ترقی اور اپنی قدامت پرستی کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے کہ ہمارے دیہاتی آج تک جدید سائنسی ترقی سے نابلد ہیں۔ اگر امریکی ہمارے دیہاتوں کو دیکھیں تو انہیں شاید ایسے سینکڑوں میوزیم اور بنانے پڑیں میں عجائب گھر سے فارغ ہو کر انڈر گراؤنڈ ٹرین سے امپائر سٹیٹ بلڈنگ پہنچے یہ عمارت انتہائی خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ امریکہ کی چند اور نیو یارک کی دوسری بلند ترین عمارت ہے۔ اس عمارت سے نیویارک کا نظارہ دیدنی ہے امپائر سٹیٹ بلڈنگ دنیا کی خوبصورت ترین عمارات میں شامل ہوتی ہے اس کا تعارف تو میں آپ سے پہلے بھی کروا چکا ہوں۔

نیویارک شہر کی سٹریٹ ۳۴ اور ففتھ ایونیو پر واقع اس عمارت کا ڈیزائن عالمی شہرت یافتہ فرم شریو۔ لیمب اور حرمن ایسوسی ایٹ کا تیار کردہ ہے۔ یہ عمارت ۱۹۳۱ء میں مکمل ہوئی اور دنیا کی پہلی عظیم عمارت کا اعزاز اسے حاصل ہے۔ عمارت کو باہر کی طرف چونے کا پتھر اور گرینائٹ لگایا گیا ہے۔ رات کو عمارت کی روشنی اور چاند کی روشنی میں لوگ خاص طور پر اس عمارت کو دیکھنے آتے ہیں۔ یہ عمارت ۱۰۲ منزل بلند ہے۔ اور اس کی اونچائی ۱۴۵۴ فٹ ہے امپائر سٹیٹ بلڈنگ کے سامنے میک ڈونلڈ میں ہلکا پھلکا لنچ کیا اور گھر کی راہ لی

امریکہ میں آنے والے لوگوں کے لئے امریکہ کا مجسمہ آزادی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اور اس مجسمہ کو دیکھنے کے لئے سیاح ہزاروں کی تعداد میں روزانہ یہاں آتے ہیں ۔ مجسمہ آزادی یا Statue of Libery نیویارک سے ملحقہ ایک چھوٹے سے جزیرے پر نصب ہے۔ اس مجسمہ آزادی پر پہنچنے کے لئے مین ہیٹن سے ایک چھوٹے شپ کے ذریعے اس جزیرے پر پہنچے انتہائی خوبصورت چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ اور اس جزیرے کے درمیان میں مجسمہ آزادی نصب ہے جو دنیا بھر میں آزادی اور جمہوریت کی علامت ہے۔ یہ مجسمہ آزادی فرانس کا امریکہ کو تحفہ ہے----

یہاں میرے ساتھ ایک عجب و غریب واقعہ پیش آیا جسے میں ساری زندگی فراموش نہیں کر سکتا۔ اصل میں یہ چھوٹے چھوٹے واقعات ہی کسی قوم کی عظمت یا ذلالت پر دلالت کرتے ہیں "لبرٹی و یلج" جانے والوں میں میرے دوست مان سنگھ کی بھتیجی بھی شامل تھی۔ یہ دس سال کی بچی ضد کر کے ہمارے ساتھ شامل ہوئی تھی کیونکہ ابھی تک اس نے لبرٹی ویلج نہیں دیکھا تھا۔

اس ورز بدھ کا دن تھا۔

جب ہم چھوٹے جہاز "فیری" میں سوار ہوئے تو میں نے خاص طور سے یہ بات نوٹ کی کہ کچھ امریکی بچی کی طرف محبت سے اور ہماری طرف غصے سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے اس کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

لیکن ---

میرے دوست کو سمجھ آ گئی۔

اس نے بتایا کہ دراصل یہاں تصور نہیں کیا جاتا کہ کوئی بچہ سکول سے بلاجواز چھٹی کرے آج چونکہ ڈے آف نہیں اور ہم سکول کی ایک طالبہ کو اپنے ساتھ لے آئے ہیں ۔

اس لئے یہ لوگ برا منا رہے ہیں -------

آپ نے اندازہ فرمایا کہ اس ملک میں تعلیم اور خصوصاً بچوں کی تعلیم کو کتنی

اہمیت دی جاتی ہے۔

اور ایک ہم ہیں کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے بچے سکول کے اوقات میں گلیوں، بازاروں، میدانوں، میں آوارہ گھومتے رہتے ہیں اور ہمارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

شاید ہم نے تعلیم کو کوئی اضافی چیز سمجھ رکھا ہے ----- اگر کبھی مہلت مل گئی تو بچوں پر بھی توجہ فرمالی۔ ورنہ اللہ اللہ خیر صلا۔

کانٹی نینل کونسل آف مساجد آف نارتھ امریکہ ایک ایسی کونسل ہے جس میں تمام امریکہ اور کینیڈا کی مساجد اور مسلم ورلڈ لیگ کا حصہ ہے جس کا قیام ۱۹۷۵ء مین مکہ مکرمہ میں عمل پذیر ہوا اس کونسل کا مقصد ورلڈ لیگ کے اس اجلاس میں یہ بتایا گیا کہ کس طرح معاشرے مین مسجد کے کردار کو ایک بار پھر فعال بنایا جائے جیسا کہ اسلام کے مایہ ناز دور میں ہوتا رہا۔

اس میٹنگ میں اس پر زور دیا گیا کہ مسجد جو ایک زمانہ میں مسلمانوں کی مذہبی' سوشل' سیاسی' معاشرتی' تعلیمی نشوونما کا محور ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ اپنا اثر و رسوخ کھو چکی ہے۔ اس کا بنیادی نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم امت کا نظریہ جاتا رہا چنانچہ ان خوبصورت جذبات کے ساتھ اس کونسل کی داغ بیل ڈالی گئی اور اس کے محور کو عالمی سطح پر استوار کیا گیا اور آج بھی ورلڈ سپریم کونسل آف مساجد کا ہیڈ کوارٹر مکہ مکرمہ میں ہے

امریکہ میں اس کا قیام ۱۹۷۲ء میں عمل میں آیا حالانکہ ۱۹۷۷ء میں ورلڈ کونسل کے بیتے ایک کانفرنس نیویارک میں منعقد ہو چکی تھی نارتھ امریکہ کی اس کونسل کا ہیڈ کوارٹر نیویارک مین ہے ۔ اگرچہ اس کر سرگرمیاں ابھی تک محدود تھیں مگر گزشتہ چند ماہ سے کونسل کے مخلص لوگوں کی کوشش تھی کہ امریکہ میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر اس کونسل کو مزید فعال بنایا جائے۔ چنانچہ شکاگو میں تین روزہ کانفرنس کا اعلان ہوا۔

اس کانفرنس میں شرکت کے لیے مندوبین کو دعوت نامے مع سفری ٹکٹ اور شکاگو کے عالیشان ہلٹن ہوٹل میں قیام طعام کے بھجوائے گئے۔ دعوت نامے کونسل میں شامل تمام مساجد کے اماموں یا پھر مسلم سینٹروں کے صدور کو بھیجے گئے اب اسے کیا کہیں کہ نہ تو ہم امام تھے نہ مقتدی بس یہ مولانا کاشمیری کی صحبت تھی کہ جس نے اس ہیمچمداں کو بھی اس قابل جانا اور ایک روز ڈاکٹر طٰہٰ ایک دعوت نامہ میرے نام بھی لے آئے پھر ڈاکٹر صاحب ہی میرے ہم سفر بھی بنے---

○

شکاگو ایئر پورٹ دنیا کے مصروف ترین ایئر پورٹ میں سے ہے مگر جمعہ کے روز صبح گیارہ بجے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے امریکہ میں اسلام کا بول بالا ہو گیا ہو۔

تمام شہروں سے کانفرنس میں شرکت کے لیے آنے والوں کی اسلام علیکم کی باز گشت ایک عجیب منظر پیدا کر رہی تھی۔

شکاگو کے پامر ہاؤس ہلٹن ہوٹل میں لابی سے صرف السلام علیکم کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں سیاہ فام امریکی مسلمانوں میں ایک خاص بات ہے کہ وہ زیادہ جذباتی ہیں۔ اور چونکہ وہ سوچ سمجھ کر اسلام لاتے ہیں اس لیے انہیں اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے اور اس کا ڈنکا وہ بڑے زور و شور سے بجاتے ہیں عربی زبان سے انہیں بہت زیادہ واقفیت نہیں ہے اس لیے جو چند ایک جملے ہیں انہیں بکثرت استعمال کرتے ہیں مثلاً کسی بھی چیز کی تعریف کریں تو وہ فوراً ماشاء اللہ کہیں گے۔

کسی چیز کی عظمت کا ذکر کرتے ہی اللہ اکبر کا نعرہ لگائیں گے۔

پوچھیے حال کیسا ہے تو مجال ہے جو انگریزی میں جواب دیں' الحمد اللہ کہیں گے۔

پھر ہمیشہ برادر کہہ کر پکارتے ہیں نماز کی پابندی کرتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ امریکہ میں سیاہ فام لوگوں کو جاہلیت سے نجات دلانے میں سب سے کامیاب اسلام

ہی رہا ہے۔ چنانچہ اگر ایک جانب سیاہ فام شخص محض اپنی ہیت سے مجرم گردانا جاتا ہے اورامریکیوں کے لئے اس کی حیثیت آج بھی منشیات فروش ' بدمعاش 'چور' اچکے' سے زیادہ نہیں ۔ وہاں بھی اگر کسی گورے امریکی کو علم ہو جائے کہ یہ سیاہ فام مسلمان ہے تو وہ اس سے خوفزدہ نہیں ہوتا اور اسے بھی "نارمل" انسان سمجھتا ہے اگر یہ معلوم ہو کہ متعلقہ شخص مسلمان ہے تو تمام اندیشے ختم ہو جاتے ہیں یہ اعجاز ہے اسلام کا کہ وہ وحشیوں کو انسانی عظمت کی مثالیں بنا دیا کرتا ہے--- افسوس ہم تو مسلمان ہو کر درندے بن گئے اور امریکی سیاہ فام درندے تھے مسلمان بنتے ہیں تو انسانیت کا فخر بن جاتے ہیں۔اسی لیے سیاہ فاموں میں یہاں اسلام کی تبلیغ کی بڑی گنجائش ہے۔ کونسل کی اس میٹنگ میں اکثریت سیاہ فاموں کی تھی۔ تاہم پاکستانی' ہندوستانی اور عرب نژاد لوگ بھی خاصی تعداد میں تھے۔

○

کونسل کے پروگرام میں متعدد سمینار لیکچر اور ورکشاپ شامل تھیں افتتاحی سیشن میں کانگریس مین اور سینٹ کے ارکان شریک ہوئے۔ خطبہ استقبالیہ ورلڈ مسلم لیگ کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف نے پیش کیا۔ میٹنگ کے چیرمین ڈاکٹر وصی اللہ خان تھے۔ جو شکاگو ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی کے چانسلر ہیں۔ امام کعبہ شیخ علی الحفیفی بھی موجود تھے۔ اگلے روز ڈاکٹر قطبی احمد نے جو نارتھ امریکہ کی کونسل کے سکریٹری جنرل ہیں خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ ان کے بعد باقاعدہ سیشن کا آغاز ہوا پہلے سیشن کا عنوان تھا"شمالی امریکہ میں اسلامی انفرادیت کا تحفظ اور مسلم خاندان کا کردار"

اس موضوع پر ڈاکٹر الیاس بایونس نے بڑی پر مغز تقریر کی ڈاکٹر الیاس نیویارک میں سوشیالوجی کے پروفیسر ہیں۔ دوسرے سیشن کا عنوان تھا" غیر اسلامی ماحول میں مسلم فیملی لاء کا تحفظ" اس عنوان سے ڈاکٹر مدثر صدیقی نے اپنا مقالہ پڑھا جو میری ذاتی

رائے میں تین روزہ کانفرنس کا سب سے زیادہ پر مغز مقالہ تھا۔ اور اسے ڈاکٹر صدیقی نے جو ہارورڈ کے فارغ التحصیل وکیل ہیں۔ اور جو بیک وقت انگریزی عربی اور اردو پر عبور رکھتے ہیں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا اور ثابت کیا امریکی آئین اور قانون کی موجودگی میں بھی اسلامی قانون نافذ ہو سکتا ہے

○

اگلے سیشن میں وقف اور مسجد کے امور زیر بحث آئے جس میں تاریخی حوالے سے مسجد اور وقف کی اہمیت اجاگر کی گئی۔ اس کے بعد دعوت حق کے موضوع پر تقریر ہوئی کہ کس طرح شمالی امریکہ میں تبلیغ ہو اسے ڈاکٹر مزمل صدیقی نے پیش کیا جو مدثر صدیقی کے بڑے بھائی ہیں اور علم و قابلیت میں بھی بلند تر ہیں بحیثیت مجموعی اس کانفرنس کا نکتہ عروج سینچر کے ظہرانے سے لوئیس فرخان کا خطاب تھا۔ لوئیس فرخان نیشن آف اسلام نامی تنظیم کے لیڈر ہیں اور ان کے تیز اور جذباتی بیانات نے انہیں امریکہ میں انتہائی معروف بنا دیا ہے۔

وہ بلا خوف سچ بات کرنے میں مشہور ہیں اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ امریکہ میں فرخان جیسا دوسرا مقرر موجود نہیں ہے۔ ان کے گروپ نے امریکہ کی چند جرائم سے آلودہ آبادیوں کو جس طرح جرائم سے پاک کیا ہے اس سے ان کی اہمیت اور مسلم ہوگئی ہے۔ فرخان کا خطاب اس لیے اور زیادہ اہمیت اختیار کر گیا کہ کانفرنس کے شرکاء مین سعودی عرب میں امریکی افواج کی موجودگی پر شدید عدم اطمینان پایا جاتا تھا مگر کھل کر بات نہیں ہو رہی تھی تاہم کانفرنس کے شرکاء کا جوش قابل دید تھا۔ ان میں سر فہرست کیلی فورنیا سے آئے ہوئے پاکستانی نژاد نثار حتی تھے پہلے انہوں نے کوشش کی کہ گلف کی سیاست بھی ایجنڈے پر لائی جائے مگر وہ ممکن نہ تھا پھر انھوں نے قرارداد پیش کرنے کی درخواست کی۔ اس دوران وہ ایک سوالنامہ لے کر آئے

جسے شرکاء محفل میں پیش کیا جس میں سعودی حکومت کی جانب سے امریکہ کو دعوت دینے پر شدید تنقید تھی اور یہ مطالبہ تھا کہ امریکی افواج فی الفور واپس بلائی جائیں۔ اور اس کی جگہ اسلامی فوج تعینات کی جائے۔

اس سوالنامے پر ۹۰ ٪ لوگوں نے مثبت جواب دیا۔ پھر انہوں نے ببانگ دہل کلمہ طیبہ پڑھا۔ اس کا انگریزی ترجمہ کیا اور یہ واضح کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی مراد محمد بن عبداللہ ہے۔ جو عرب تھے۔ کیوں کہ کچھ لوگ یہ غلط فہمی پھیلاتے تھے کہ فرخان کی مراد امام فرہاد محمد سے ہے جنہوں نے عیلجاہ محمد کو مسلمان کیا تھا۔ ان کے اس اعلان پر تمام حاضرین دخور جذبات سے کھڑے ہو گئے اور دیر تک تالیاں بجاتے رہے۔

خاص طور پر سیاہ فام مسلمانوں کا دوسرا گروپ جن کی قیادت امام وارث محمد کرتے ہیں جو علیجاہ محمد کے بیٹے ہیں اور جنہوں نے اپنے والد کے چند اختلافی خیالات کو ترک کر دیا ہے اور اب ان کی مغفرت کی دعائیں کرتے ہیں۔

کانفرنس کے الوداعی ظہرانے میں باکسر محمد علی بھی شریک ہوئے۔ محمد علی بلاشبہ امریکہ کی مقبول ترین شخصیت ہیں۔ انہیں امریکی کانگریس سے لر کر وہائٹ ہاؤس تک رسائی حاصل ہے اور اکثر سیاسی مشن پر وہ کانگریس کے چکر لگاتے ہیں۔ تاہم ان کی بیماری نے انہیں بے حد کمزور کر دیا ہے دوائیں اپنے اثرات دکھاتی ہیں گو بظاہر وہ صحت مند ہیں مگر ان کی جسمانی پھرتی جس کے لئے کبھی ساری دنیا حیران رہ جایا کرتی تھی اب ماضی کا خوبصورت خواب بن چکی ہے۔

الودعی ظہرانے سے امام وارث محمد نے خطاب کیا۔ امام وارث کے ساتھ سیاہ فام مسلمانوں کی عقیدت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ امام وارث نے بھی اپنی تقریر میں کہا کہ اس کانفرنس کا نکتہ عروج برادر فرخان کا اعلان ہے اور اب ہم لوگ آپس میں مل کر تبلیغ اسلام کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

کانفرنس میں کئی قرار دادیں منظور ہوئیں جن میں سر فہرست امریکی افواج کی

سعودی عرب سے واپسی کا مطالبہ تھا۔ کانفرنس سے تمام شرکاء تبلیغ اسلام کے لیے ایک نیا جوش اور ولولہ لے کر اٹھے جسے دیکھ کر کم از کم میرے جیسے کمزور اور انتہائی گناہگار مسلمان کا دل بھی امید کے جذبات سے اور آنکھیں شکرخداوندی کے احساس سے بھر آئیں۔ دل نے کہا کہ ضرور ایک دن ایسا آئے گا جب ہم بے نوا اور بے بس مسلمان جنہیں حکمرانوں کی بداعمالیوں نے آج دنیا میں رسوا کر کے رکھ دیا ہے اللہ کی نصرت اور تائید کے بھروسے پر اگر اپنے ایمان پر قائم رہے تو وہ دن دور نہیں جب عالمی سازشوں کے باوجود جو مسلمانوں کے خلاف غیر مسلم دنیا روا رکھتی ہے ضرور انشاء اللہ اپنا کھویا ہوا اعزاز حاصل کرلیں گے -----

آج امریکہ میں ۶۰ لاکھ مسلمان آباد ہیں ------

میرا دل کہتا ہے کہ ان کی ایک چوتھائی تعداد غیرت ایمانی سے سرشار ہے اور وہ اس مادیت پرست معاشرے میں رہنے کے باوجود ضرور یہ سوچتے ہیں کہ عام اسلام کو توقیر کیسے حاصل ہو -----

ہماری گمشدہ عزت، کھویا ہوا مقام کیسے واپس لوٹے ------

وہ دن انشاء اللہ ضرور آئے گا جب ہم سرخرو ہوں گے اور مغرب میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا عروج دیکھنے کو ملے گا۔

○

امریکہ کی آبادی میں سیاہ فام افراد کا حصہ بیس فیصد ہے لیکن امریکہ میں بسنے والے سیاہ فام افراد موثر قیادت کے فقدان کے باعث بکھرے ہوئے ہیں۔ اور امریکی سیاست پر ان کا وہ اثر اور وزن نہیں جو ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ امریکی سیاہ فام امریکی سیاست میں دلچسپی نہیں لیتے۔ مجھے متعدد سیاہ فام افراد سے ملنے کا اتفاق ہوا ان کی اکثریت اپنے حلقے میں پارلیمنٹ کے ممبر کے نام سے واقف نہیں تھی۔

متعدد سیاہ فام افراد نے ووٹ ہی نہیں بنایا۔ اور انہوں نے گذشتہ کئی سالوں سے

اپنے اس حق کو استعمال ہی نہیں کیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ امریکہ میں بسنے والے تمام سیاہ فام افراد میں سیاسی شعور پیدا کیا جائے اور ان میں امریکی سیاست میں آگے بڑھنے کی تڑپ پیدا کی جائے اس وقت سیاہ فام امریکی امریکہ نیویارک اور واشنگٹن سمیت اہم شہروں کے میئر ہیں۔ ۲۰ فی صد امریکہ سیاہ فام اگر اکٹھے ہو جائیں تو امریکہ کا مستقبل امریکہ کی سیاست نہ صرف ان کے ہاتھ میں ہوگی بلکہ امریکی خارجہ پالیسی کی بنیادی اساس اور ترجیحات بدل جائیں گی جو ایشیا اور افریقہ کے مفاد میں ہوں گی۔

امریکہ کی معاشرتی زندگی کے بعض پہلوؤں سے پردہ اٹھائیں تو نہایت خوفناک مناظر سامنے آتے ہیں۔ اس کی تہذیب کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ اس کا فلسفہ زندگی شتر بے مہار کی طرح ہے۔ جدھر منہ اٹھ گیا۔ اسی رخ پر چلتا گیا۔ امریکی زندگی کا فلسفہ یہ ہے کہ ایک فرد کوئی جرم کرے تو وہ مستحق عقوبت لیکن قوم کوئی جرم کرے تو لائق تحسین اور اس کا جرم تہذیب و ثقافت اور قابل فخر طریق زندگی پاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک فرد نے چوری کی۔ مغربی قانون فوراً حرکت میں آگیا اور چور کو سزا دیدی۔ لیکن یہی چوری جب کوئی ادارہ کرتا ہے تو قانون منہ میں قلم لے کر بیٹھ جاتا ہے اور اگر یہ چوری پوری قوم میں سرایت کر گئی تو یہ عین تہذیب و ثقافت اور قانون بن گئی۔

امریکہ میں ایک زمانے میں شراب نوشی کو ممنوع قرار دینے کی بڑی کوشش کی گئی تھی لیکن دیکھا گیا کہ خود قانون ساز اور قانون نافذ کرنے والے بھی اس عادت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔ پولیس ان افراد کو پکڑ کر لے گئی تو تھوڑی دیر بعد دیکھا گیا کہ پولیس کے سپاہی بھی ملزمان کے ساتھ شغل شراب نوشی میں شامل ہو گئے۔ امریکی قومی لیڈروں نے یہ طے کیا کہ شراب نوشی پر پابندی لگانا غلط ثابت ہوا ہے۔ امتناع شراب کا قانون کچھ عرصہ نافذ رکھنے کے بعد منسوخ کر دیا

گیا اور شراب نوشی قوم کا شعار بن گئی۔ گویا ایک فرد کے لیے جو جرم تھا پوری قوم نے شروع کیا تو تہذیب و ثقافت کا خصوصی حصہ بن گیا۔ امریکی اخبارات اور جرائد میں اداروں کے جرائم کے بارے میں بہت کچھ شائع ہوتا رہا ہے یو ایس نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ نے ایک بڑی دلچسپ رپورٹ شائع کی جس میں بتایا گیا کہ افراد کے جرائم تو نمایاں ہو جاتے ہیں۔ لیکن اداروں کے جرائم مخفی رہتے ہیں اور قانون کا ہاتھ بھی انہیں نہیں پکڑ سکتا۔ قانون کے ایک پروفیسر نے کہا کہ اگر اداروں کے جرائم کی تفصیل جمع کی جائے قوم انگشت بدنداں رہ جائے۔ اس رپورٹ میں خیانت اور بددیانتی کی بعض دلچسپ مثالیں دی گئی ہیں۔

ایک مرتبہ ایک شہری نے دودھ والوں کے خلاف رٹ دائر کر دی کہ دودھ والوں نے مناسب منافع کی بجائے لوٹ مچا رکھی ہے عدالت نے دودھ کی لاگت اور قیمت کا جائزہ لینے کے لیے ماہرین کو طلب کیا۔ تحقیق کے بعد یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ۲۵ دودھ فروش کمپنیاں دس برس سے گاھکوں سے دس فیصد زائد قیمت وصول کر رہی تھیں۔ عدالت نے ان کو ۶۷ لاکھ ڈالر جرمانہ کیا لیکن وہ جرمانہ تو حکومت (سٹیٹ) کے میں خزانہ چلا گیا۔ جن لوگوں کو اتنی مدت لوٹا گیا تھا ان کی کوئی تلافی نہ ہو سکی۔

امریکہ میں قومی صحت کے لیے اربوں ڈالر مخصوص کیے جاتے ہیں۔ کوئی شہری بیمار پڑ جائے تو اس کا علاج معالجہ حکومت کے ذمہ ہے۔ ڈاکٹروں کو اختیار ہے کہ وہ اس کے لیے نسخہ تجویز کر کے ادویات بھی فراہم کریں۔ ادویات کی فراہمی کے لیے ہر شہر میں ڈرگ سٹور ہیں۔ اب ان کی سپلائی میں کیسے گھپلا کیا جاتا ہے۔ وہ ملاحظہ ہو۔ ایک مرتبہ اوہیو شہر کا ایک کیس عدالت میں پیش ہوا۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران معلوم ہوا کہ اوہیو کے میڈیکل پروگرام میں پانچ لاکھ ڈالر کی خیانت ہوئی ہے۔ ٹیکس کی چوری تو اہل امریکہ کے لیے شیر مادر ہے۔ رپورٹ میں چوری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ عام تاثر یہ ہے کہ جرم سے کبھی فائدہ نہیں ہوتا لیکن اداروں کے

جرائم نے ثابت کر دیا ہے ہر جرم سے فائدہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک بہت بڑی کمپنی ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر کی ٹیکس چوری میں ملوث پائی گئی ہے لیکن اس کے عام قانونی حصہ دار ڈائریکٹر کمپنی کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن تھے۔

○

ملک میں قانون کے پر جوش نفاذ اور مجرموں کے ساتھ پولیس کے سخت رویے کے باعث گزشتہ پانچ سال میں جرائم کی شرح میں خاصی کمی ہو گئی تھی لیکن گزشتہ سال کے اختتام تک ایک اعشاریہ آٹھ فیصد اضافہ ہوا ہے مغربی امریکہ میں رہنے والے لوگ زیادہ تر مجرموں کی سرگرمیوں کی شکار ہوئے لیکن شمال مغربی امریکہ میں رہنے والے جرائم کی اس لہر سے کم متاثر ہوئے تھے۔

بیورو آف جسٹس کے اعداد و شمار کے ایک جائزے میں اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ امریکہ میں جرائم کی رفتار خوفناک حد تک بڑھ رہی ہے۔ قومی اعتبار سے گھریلو قسم کے جرائم کی تعداد ۶ لاکھ ۱۳ ہزار سے بڑھ کر ۳ کروڑ ۷ ۴ لاکھ تک جا پہنچی ہے۔ نیشنل کرائم سروے کے مطابق گزشتہ سال ۳ کروڑ ۴۱ لاکھ مقدمات درج ہوئے تھے۔ جو گزشتہ پندرہ سال میں سب سے کم تھے۔ جرائم میں اضافہ ہونے کے باوجود مقدمات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ایڈمنسٹریشن حکام کا کہنا ہے کہ جرائم میں کمی کا سبب عوام کا تعاون سے زیادہ قانون پر سختی سے عمل درآمد کرانا تھا۔

اکیڈمی کے بعض ماہرین نے ان اعداد و شمار کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں نوجوانوں میں جرائم کم ہو گئے ہیں۔ ماہرین آبادیات کا کہنا ہے کہ ۱۹۹۰ء کے ابتدائی عشرے تک اس گروپ کے لڑکوں میں جرائم کا رجحان کم ہوا ہے جبکہ بہت سے ماہرین کا خیال ہے کہ جرائم کی سطح غیر متوقع طور پر بہت بڑھ چکی

ہے۔ غالباً گزشتہ سال جرائم میں اضافے سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ جرائم کا ارتکاب کم آمدنی والے گروپس میں زیادہ ہو گیا ہے گزشتہ سال چاروں قسم کے جرائم مثلاً زنا بالجبر 'ڈکیتی' چوری اور گھیراؤ میں اضافہ ہوا ہے۔ اس میں قتل بھی شامل ہے۔ گھریلو جرائم میں تین لاکھ ۶۰ ہزار یا دو اعشاریہ تین فی صد اضافہ ہو کر ان کی تعداد ایک کروڑ ۵۱ لاکھ ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اٹھائی گیری رسہ گیری اور موٹر وہیکلز کی چوری میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

۱۹۹۰ء میں مغربی امریکہ میں ذاتی جرائم کی شرح ۱۲۵ء فی ہزار تھی۔ گھریلو جرائم کی تعداد مغرب میں ۳۲۳ ۔ وسط مغرب ۱۹۶ ۔ جنوب میں ۷۹ اور شمال مشرق میں ۱۱۹ فی ہزار تھی ۔ مغرب ہی وہ علاقہ ہے جس میں گزشتہ سال کم جرائم ہوئے تھے جبکہ شمال مشرق اور وسط مغرب میں کوئی نمایاں فرق نہیں پڑا۔ یہ سروے ۴۹ ہزار گھروں میں رہنے والے ۹۳ ہزار لوگوں سے سوالات کرنے کے بعد نیشنل کرائم سروے نے مرتب کیا ہے۔

○

ایف بی ائی کی ایک رپورٹ کے مطابق نیویارک امریکہ میں ڈکیتی کی وارداتوں کا سب سے بڑا مرکز بن چکا ہے۔ گزشتہ سال نیویارک میں مجموعی طور پر ۹۳۳۷۷ ڈکیتیاں ہوئیں جس کا مطلب ہر چھ منٹ کے بعد ایک ڈاکہ ہے سرکاری ذرائع کے مطابق اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ امریکی عوام میں اسلحہ اور باڈی گارڈز رکھنے کے رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے اسی طرح سنگین جرائم کے سلسلے میں قتل کی وارداتوں میں واشنگٹن پہلے نمبر پر ہے جہاں عوام پر ہمہ وقت قتل کا خوف طاری رہتا ہے۔

امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں باشندے بنیادی ضرورتوں سے محروم زندگی گزار رہے ہیں سرکاری اعداد وشمار کے مطابق بے گھر افراد کی بہت بڑی تعداد زیر زمین

ٹرینوں اور پلیٹ فارموں پر رہتی ہے جو موسمی اثرات سے ان کو محفوظ رکھتے ہیں۔ ایسے بے گھر افراد کی تعداد نیو یارک میں ۶۰ ہزار۔ لاس اینجلز میں ۳۰ ہزار۔ شکاگو میں ۲۰ ہزار اور سان فرانسکو میں ۵۰ ہزار سے زائد ہے۔ کیا کوئی بھی امریکی رہائش کے حق کو بنیادی انسانی حقوق میں شامل کرنے کے حق سے انکار کر سکتا ہے؟

اس سوال کا حتمی جواب جو بھی ہو لیکن سرکاری طور پر جمع شدہ اعداد و شمار کے مطابق امریکہ میں بے گھر افراد کی مجموعی تعداد چار لاکھ ہے۔ جبکہ قومی اکیڈمی برائے سائیسز کی رپورٹ کے مطابق یہ تعداد ساٹھ لاکھ ۳۵ ہزار ہے۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی کی شماریاتی رپورٹ ' قومی اکیڈمی کی رپورٹ کے اندازوں سے ہم آہنگ ہے جس کے مطابق امریکہ میں بے گھر افراد کی تعداد ۳۰ لاکھ ہے۔

سرکاری طور پر ان عددی حقائق کو پروپیگنڈے کا نام دے کر عالمی برادری کی آنکھوں میں دھول ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور بے گھر افراد کو کام چور اور ذہنی مریضوں کے کھاتے میں ڈالا جارہا ہے۔ اس ضمن میں شکاگو یونیورسٹی کی پروفیسر نیچلہا سوسن نے اس دلیل کو مسترد کر دیا اور بتایا بے گھر افراد پہلے ملازمتیں کر رہے تھے لیکن ان میں سے بیشتر چھ ماہ سے بے گھر ہیں امریکی پروفیسر کی تحقیق کا دائرہ کار شکاگو تک محدود ہے بہرحال یہ بات حتمی ہے کہ امریکہ کی کل آبادی ۲۴ کروڑ ۶۱ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے لیکن صرف ۵ کروڑ ۷۴ لاکھ ۲۴ ہزار افراد کے پاس ذاتی مکانات ہیں۔

مغرب کے بیشتر ممالک کے بارے میں صرف ایسی ہی خبروں پر غریب ممالک کے عوام یقین کر لیتے ہیں کہ وہاں کے عوام عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ معاشرہ میں اعلیٰ اقدار فروغ پذیر ہیں اور یہ ممالک تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہیں یہی وجہ ہے کہ پاکستان' بھارت' بنگلہ دیش' سری لنکا' نیپال وغیرہ سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ امریکہ جانے کے لئے ہر غیر قانونی طریقہ اختیار کرتے ہیں تاکہ وہ امریکہ میں اعلیٰ زندگی گزار سکیں اس امر سے قطع نظر کہ وہاں کے عوام کا اصل معیار زندگی کیا ہے؟

سردار گنگا سنگھ ڈھلوں کا مختصر تعارف میں آپ کو کروا چکا ، جب ۱۹۹۱ء میں بھارتی حکومت کی طرف سے الیکشن کا اعلان کیا گیا تو بیرونی ممالک مقیم سکھ لیڈروں میں گنگا سنگھ ڈھلوں کی واحد شخصیت ایسی تھی جس نے پنجاب میں اکالی دل کے مقتدر رہنما سمرن جیت سنگھ مال کی حمایت کی اور انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کیا۔

خیال رہے کہ ان دنوں سکھوں کے ''ملی ٹنٹ گروپ'' نے الیکشن کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ لیکن خالصتان تحریک کے صف اول کے راہنماؤں میں شمار ہونے والے گنگا سنگھ ڈھلوں کی طرف سے اچانک اس بدلے ہوئے نقطہ نظر نے ان کے متعلق بڑی عجیب افواہوں کو جنم دیا۔ مجھے سان فرانسکو کی سکھ پریڈ میں سردار صاحب سے ملاقات کا موقعہ ملا تو اس کو غنیمت جان کر فوراً یہ انٹرویو کیا بعد میں سردار صاحب کا یہ انٹرویو میں نے نوائے وقت میں شائع کیا اور اسی انٹرویو کو من و عن قریباً تمام بھارتی اخبارات کے علاوہ امریکہ اور یورپ کے اخبارات نے بھی شائع کیا۔

سوال۔ بھارتی پنجاب میں سکھوں کی تحریک آزادی کی تازہ ترین صورت حال کیا ہے؟ اس سوال کا جواب وزیر اعظم چندر شیکھر اور سردار سمرن جیت سنگھ کی حالیہ گفتگو کے پس منظر میں دیجئے؟۔

جواب۔ دو سال پہلے میں نے اپنے ایک مضمون ''آج کا سکھ'' میں مشرقی پنجاب میں حالات کی سنگینی پر بحث کرتے ہوئے مستقبل سے متعلق کچھ خدشات اور سکھ جدوجہد کے متعلق اپنے نظریات کا اظہار کیا تھا۔ اس درمیان دنیا میں بہت تبدیلیاں آئی ہیں۔ مغربی افریقہ ، روس ، مشرقی یورپ میں بہت کچھ بدل گیا خصوصاً ایک

نکتہ نظر جو سامنے آیا ہے وہ یہ ہے کہ آزادی کے بنیادی انسانی حق کو تسلیم کیا گیا ہے اور جابر طاقتیں مجبور ہو گئی ہیں کہ وہ مظلوموں کو ان کا حق ادا کریں۔ ان حالات میں آپ کو دنیا میں صرف بھارت کی ایک ایسی مثال ملے جو ہٹ دھرمی سے ابھی تک اپنی ضد پر قائم ہے۔

آزادی اب صرف نعرہ ہی نہیں رہ گیا یہ خواہش اور انسانی جبلت ہے جس سے کسی کو انکار ممکن نہیں۔ انسانی آزادی کا احترام مہذب قوموں کا شیوہ ہے اگر کوئی قوم ۲۰ویں صدی کے اختتام پر بھی وحشیانہ پن کا مظاہرہ کرنے پر تلی ہے تو اس پاگل پن کا علاج کیا ہو سکتا ہے؟ اس کا فیصلہ بھی مہذب دنیا کو کرنا ہے سردار سمرن جیت سنگھ مان نے بھارتی وزیر اعظم کی مذاکرات کی بات مان کر اپنے ذمہ دار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ یہ تاثر انہوں نے غلط ثابت کر دیا کہ سکھ صرف مار دھاڑ کرنے والی قوم ہے بلکہ انہوں نے دنیا کو باور کروایا ہے کہ ہم تو دراصل امن سے بھائی چارے سے مل بیٹھ کر اپنے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں اب ہوا یہ کہ بھارتی وزیر اعظم نے جو دراصل کیئر ٹیکر قسم کے وزیر اعظم ہیں اپنے پیشروں کی طرح انہیں بھی ٹالنے کی پالیسی اور وقت گزارنے کی راج نیتی کا حصہ بنانا چاہا یہ الگ بات ہے کہ انہیں اس میں کامیابی نہ ہو سکی کیونکہ سردار سمرن سنگھ مان جس آدمی کا نام ہے وہ کبھی سکھوں کی مرضی کے خلاف ان کے مفادات کا سودا نہیں کرے گا۔

بھارتی حکومت کی طرف سے اپنے ملک میں بسنے والی اقلیتوں کے مطالبات کو اہمیت نہ دینا اسلحے اور طاقت کے زور پر اپنی ضد منوانا اس کے طاقتور ہونے کی نہیں بلکہ اخلاقی طور پر ان کے دیوالیہ پن کی دلیل ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ۴۰ سال سے ایک حکومت اپنے ملک کی ۷۵ فیصد آبادی کو نظرانداز کر رہی ہے اور عالمی رائے عامہ خاموش ہے۔ کیا اس سے یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ اس جرم میں بھارت اکیلا نہیں بلکہ خود کو مہذب کہنے والی اقوام بھی اپنے مخصوص مفادات کے تحت اس کی حمایت کرتی ہیں۔

سوال۔ حال ہی میں بھارتی وزیر اعظم چندر شیکھر کی طرف سے سکھ حریت پسندوں کو بات چیت کی دعوت دی گئی ہے اور اب بھارتی حکومت نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کا مثبت جواب بھی انہیں مل چکا ہے۔ کیا آپ بھارتی حکومت سے براہ راست مذاکرات کو پسند کرتے ہیں جبکہ اس سے پہلے پنتھک کمیٹی کی طرف سے بات چیت سے انکار کیا جا چکا ہے۔

جواب ۔ میں ہمیشہ اس بات کے حق میں رہا ہوں کہ گفت و شنید کا دروازہ کبھی بند نہیں ہونا چاہیے. اس کے ساتھ ساتھ اپنی جدو جہد میں بھی کبھی سستی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ میری اطلاعات کے مطابق حریت پسندوں نے بات چیت کرنے کی ہامی تو بھری ہے لیکن ابھی تک کسی جگہ یا تاریخ کا تعین نہیں کیا گیا۔ یہ جائز اور مناسب قدم ہے جو انہوں نے اٹھایا ان کا کہنا ہے کہ یہ بات چیت بھارت سے باہر کسی غیر جانبدار ملک میں ہو ان کو مکمل تحفظ اور پرٹوکول دیا جائے اور بات چیت کے کامیاب یا ناکام دونوں صورتوں میں پندرہ دن بعد تک ان کو تحفظ کی ضمانت ملنی چاہیے تا کہ وہ محفوظ طریقے سے جہاں جہاں سے آئے ہوں وہاں پہنچا دیے جائیں۔ میری ذاتی رائے یہ بھی ہے کہ یہ پراپیگنڈہ سٹنٹ تو ہو سکتا ہے جو بھارتی حکومت کی عادت ہے ورنہ وہ حکومت جس کے ایوان میں صرف ۵۶ ممبر ہوں ۲۴۵ میں سے وہ کیا بات کرے گی۔ اس حکومت کا مقصد تو یہ ہے کہ چندر شیکھر حکومت کسی نہ کسی طرح اگلے الیکشن تک کا وقت نکال سکے۔ اس حکومت کو بھارتی عوام یہ مینڈیٹ دینے کے لئے تیار نہیں۔ کہ یہ حکومت ملک کے بنیادی مسائل پر کوئی حتمی فیصلہ کر سکے خصوصاً خالصتان یا کشمیر کا مسئلہ یہ حکومت حل کر ہی نہیں سکتی یہی نہیں بلکہ کوئی بھی بھارتی حکومت کبھی یہ مسائل حل نہیں کر سکتی۔

سوال ۔ وہ کیوں؟۔

جواب ۔ کیونکہ سکھوں اور کشمیریوں کا واحد مسئلہ آزادی کا حصول ہے۔ خالصتان کو ایک مکمل اور آزاد ریاست بنانے کے لئے سکھ حریت پسند سرگرم عمل

ہیں اور کوئی بھارتی حکومت ان کا مطالبہ ماننے کا خطرہ کبھی مول نہیں لے سکتی کیونکہ سکھ اگر آزاد ہو جائیں کشمیر آزاد ہوجائے تو بھارت سر کے بغیر راون رہ جائے گا۔ باقی انگ اس کے ایک ایک کر کے ٹوٹ جائیں گے۔

سوال ۔ اس ضمن میں سکھ حریت پسندوں کا رویہ بڑا عجیب رہا ہے پہلے تو پنتھک کمیٹی کی طرف سے اعلان ہوا کہ سمرن جیت سنگھ مان جو بات چیت حکومت کے ساتھ کرنے جا رہے ہیں ان میں فریڈم فائٹرز کی مرضی شامل نہیں اور وہ اس گفتگو کی نمائندہ حیثیت کو نہیں مانیں گے اس کے بعد کہا گیا کہ ہم بھارتی آئین کے اندر رہ کر بات نہیں کریں گے پھر کہا گیا کہ بات چیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اس کے بعد کہا گیا کہ صرف خالصتان کے مسئلے پر ہی بات ہو سکتی ہے۔ یہ بار بار موقف کی تبدیلی کیا سکھوں کی کمزور پلاننگ کی نشاندہی نہیں کرتی۔ کیا اس سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ سیاسی طور پر سکھ حریت پسند بالکل بودے ہیں اور کسی ایک نقطہ نظر پر متفق نہیں ہو سکتے؟۔

جواب۔ میرے جو بھائی بیٹے حریت پسند اپنے سر ہتھیلی پر رکھ کر خالصتان کی آزادی کے لئے سرگرم عمل ہیں ۔ ان کے متعلق ایک بات ذہن نشین کر لیجئے کہ وہ کسی جگہ اپنا راج سنگھاسن سجا کر نہیں بیٹھے۔ ان کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ خدا جانے وہ دن کہاں اور رات کہاں گزارتے ہیں بسا اوقات آپس میں رابطہ کرنے کے لئے بھی مدت لگ جاتی ہے اور بسا اوقات راطہ کرنے کی کوشش میں نوجوان مارے جاتے ہیں۔ ایسے دشوار حالات میں اول تو ایک جگہ مختلف لوگوں کا اکٹھے ہونا ہی ایک اہم مسئلہ ہے پھر اکٹھے ہو کر کسی ایک نتیجے پر پہنچنا کار دارد ہے۔ اس سلسلے میں بیرون ملک ساتھیوں سے بھی صلاح مشورہ کرنا ہوتا ہے۔

عین ممکن ہے جو پہلا رابطہ ہوا ہے اس نے کہا ہو کہ ہم بات کرنے کے لئے تیار ہی نہیں۔ اس کے بعد جیسے جیسے لوگ اکٹھے ہوئے بالاخر وہ اس اہم فیصلے پر پہنچ گئے میرے نزدیک انہوں نے انتہائی دور اندیشی سے کام لے کر یہ فیصلہ کیا ہے انہوں

نے شرائط عائد کی ہیں وہ بھی محل نظر رہیں اور بہت سوچ بچار کے بعد ہی فیصلہ کیا گیا ہے۔

آج کے دور میں لڑائی صرف میدان جنگ میں ہی لڑی نہیں جاتی بلکہ اسے کئی محاذوں پر بیک وقت لڑنا ہوتا ہے انقلابی لڑائی بھی ضروری ہے عوام میں تنظیم بندی بھی ضروری ہے پراپیگنڈے کا بھی اپنا میدان ہے اور یہ فیصلہ جو میرے نوجوان بھائیوں نے کیا بڑی دور اندیشی کی بات ہے اور یہ دنیا میں پہلی مرتبہ نہیں ہو رہا۔ آپ کے سامنے ملائشیا سنگاپور کی مثال موجود ہے دونوں لڑ کر ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے۔ ایک ملک ملائشیا نے بیٹھ کر بات چیت کر کے فیصلہ کیا کہ ہمارے ہاں جو چینی اقلیت موجود ہے اس کے حقوق کا تحفظ اکٹھے رہ کر ممکن نہیں۔ بیٹھ کر بات ہوئی اور سنگاپور کا قیام عمل میں آگیا۔ اسی طرح بھارتی حکومت اور کیا کر سکتی ہے۔ کیا ساری زندگی وہ لوگ سکھوں کے ساتھ جنگ میں مصروف رہیں گے؟ یہ تو کوئی عقلمندی کی بات نہیں۔ میرے خیال میں بھارتی حکومت کا اپنا مفاد اور باقی بھارت کی سلامتی بھی اسی میں ہے کہ وہ سکھوں کے ساتھ بیٹھ کر معاملہ طے کرے اور میرے حریت پسند بھائیوں نے بھی دنیا کے سامنے ثابت کر دیا کہ وہ غیر ذمہ دار نہیں بلکہ ذمہ دار انقلابی ہیں۔ اور صرف مرنے مارنے پر ہی یقین نہیں رکھتے بلکہ وہ بات چیت کے ذریعے بھی اپنا مسئلہ حل کرنے کے خواہش مند ہیں اور حالات کے پیش نظر اپنی پالیسی تبدیل بھی کر سکتے ہیں وہ ہٹ دھرم نہیں۔

یاد رکھئے دنیا کی کسی بھی لڑائی کا فیصلہ بالاخر مذاکرات کی میز پر ہوتا ہے خواہ ہار کر مذاکرات کیے جائیں خواہ فتح حاصل کرنے کے بعد مذاکرات کیے جائیں۔

سوال۔ موجودہ حالات میں کیا مشرقی پنجاب میں آپ الیکشن کی حمایت کریں گے؟ اور وہ بھی بھارتی آئین کے مطابق؟۔

جواب۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ کوئی میدان دشمن کے لئے خالی نہیں چھوڑنا چاہئے۔ کوئی بھی میدان بغیر لڑے دشمن کے ہاتھ میں کیوں جانے دیا جائے۔

اگر عوام آپ کے ساتھ ہیں تو آپ کیوں نہ الیکشن لڑ کے وہاں اپنے ہمدرد لوگوں کی حکومت قائم کروائیں۔ جو حکومت آپ پر ظلم نہ کر سکے۔ آپ کے ساتھ زیادتی نہ کر سکے۔

الیکشن میں حصہ نہ لینے کا مطلب ہے کہ آپ نے جیل کی چابیاں دشمن کے ہاتھ میں سونپ دیں۔ پولیس کے ڈنڈے اور ہتھکڑیاں آپ نے اپنے مخالفین کے ہاتھ میں سونپ دیں وہ لوگ جو آپ کے ہمدرد ہیں۔ جن کی ہمدردیاں سکھ حریت پسندوں کے ساتھ ہیں لیکن وہ ہتھیار اٹھا کر زیر زمین نہیں چلے گئے اگر وہ لوگ بر سر اقتدار آجائیں تو پھر پنجابی کی وہ کہاوت تو آپ کو یاد ہو گی کہ اگر کوئی اپنا مارے گا تو چھاؤں میں ہی پھینکے گا۔ اس لئے میں اس بات کا حامی ہوں کہ جو لوگ پنجاب میں زیر زمین نہیں چلے گئے لیکن خالصہ راج بھاگ کا جذبہ رکھتے ہیں وہ ضرور الیکشن لڑیں' کامیاب ہوں اور انتخاب کے ذریعے وہ اس لڑائی کو جتنا آگے لے جا سکتے ہیں۔ فتح کے جتنا نزدیک ہو سکتے ہیں ضرور لے جائیں۔

اس کے مقابلے پر جو ہتھیار بند مجاہد ہیں وہ اپنا جہاد جاری رکھیں۔ ہر محاذ پر لڑائی جاری رہنی چاہئے۔

سوال۔ اس طرح تو آپ نے اپنی موقف کی خود ہی نفی کر دی۔ ایک طرف تو آپ آزاد اور خود مختار خالصتان کے لئے جدو جہد کر رہے ہیں۔ اور بھارتی آئین کو تسلیم ہی نہیں کرتے اور دوسری طرف اسی آئین کے تحت انتخابات میں حصہ بھی لینے جا رہے ہیں؟۔

جواب۔ ملکی آئین کو میں نہیں مانتا لیکن ایسے لاکھوں لوگ ہیں جو بھارتی آئین کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے لیکن وہ ذہنی جسمانی یا مالی طور پر ہتھیار اٹھانے کے لئے تیار نہیں۔ انہیں حالات اجازت نہیں دیتے۔ کہ اپنا گھر بار چھوڑ کر زیر زمین چلے جائیں۔

وہ کیوں نہ دوسرے محاذ پر جنگ لڑیں' انتخابی موچہ لگائیں اور بھارتی آئین کے تحت اگر وہ الیکشن لڑ کر کامیاب ہو کر ایسی حکومت بنانے میں کامیاب ہو جائیں جس کی ہمدردیاں ان سکھوں کے ساتھ ہوں جو آزاد اور خود مختار خالصتان کے حصول کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ تو میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا۔ یہ تو سکھ قوم کی بڑی عقل مندی ہو گی کہ وہ بھارتی آئین کے تحت بھی جو لڑائی ہے اس میں بھی شکست نہ کھائے اور حکومت ہند کو ناکام کریں اور انقلابی میدان میں بھی کامیابی حاصل کریں۔

سوال۔ سکھوں اور کشمیریوں کے یورپ اور امریکہ میں مشترکہ مظاہروں کے بعد سکھوں کے ایک بڑے طبقے کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ پاکستانی عوام جس طرح اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کر رہی ہے۔ اسی طرح سکھوں کی بھی بر ملا حمایت کرے۔ کیا اس طرح پاکستان کی اپنی حیثیت مجروح نہیں ہوتی اور بھارتی الزامات کہ پاکستان سکھوں کا مددگار ہے کو تقویت نہیں ملے گی؟ آپ پاکستان سے کیا امید رکھتے ہیں؟۔

جواب۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں اگر میں واشنگٹن میں بیٹھ کر جب یہ خبر پڑھتا ہوں کہ میرے ایک دیرینہ دوست ایس ایم ظفر صاحب آج کل ہیومن رائٹس کے چیئرمین کی حیثیت سے غیر ملکی دورہ کر رہے ہیں اور اپنی ہر تقریر میں وہ کشمیریوں پر ہونے والے ظلم و ستم کا تذکرہ کرتے ہیں اور ہر فورم سے یہ بات کہتے ہیں لیکن ہمارے متعلق ہمدردی کا ایک لفظ ان کی زبان سے نہیں نکلا۔ میں حیران ہوں کہ گذشتہ ٦ سال سے ہم عملاً جنگ کی حالت میں ہیں ہمارے ہزاروں جوان بچے مائیں بہنیں سہاگنیں ماری گئیں اور آپ ہمدردی کا ایک لفظ نہیں کہہ رہے۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ موجودہ حکومت حتیٰ کہ جنرل ضیا الحق مرحوم کی حکومت جنہیں سکھ اپنا محسن جانتے ہیں نے بھی کبھی سکھوں کی عملی مدد کے متعلق نہیں سوچا۔ نہ ہی کبھی اس مسئلے کو زیر بحث لایا گیا ٹھیک ہے صدر ضیاالحق مرحوم کے

دور میں ہمیں اپنی عبادت گاہوں میں آ کر اپنے عقیدے اور دھرم کے مطابق عبادت کی آزادی تھی لیکن اس سے " نہ ہم نے کبھی مطالبہ کیا نہ ہی یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے آخر ہم پاکستان کی بین الاقوامی ساکھ کو کیوں داؤ پر لگائیں گے۔

ہم پاکستانی عوام کے دلی جذبات کا احترام کرتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ خدا پاکستان کو ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے اسے دشمنوں کے شر سے بچائے رکھے خصوصاً ہم اپنے پنجابی بھائیوں کے بے حد شکر گزر ہیں لیکن دنیا کی کوئی طاقت یا ضابطہ اخلاق انہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ وہ اپنے کشمیری بھائیوں جیسی مظلوم ایک قوم کے لئے جو ان کے ہمسائے میں آباد ہے۔ کم از کم "آہ کا نعرہ" تو ضرور لگائے۔

میں خود ایک دھرمی آدمی ہوں۔ میں دعا کی قوت پر یقین رکھتا ہوں۔ ہمارے لئے بھی دعا کیجئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے ساتھ ہونے والی زیادتی پر پاکستان جو اقوام متحدہ کا ممبر ہے ضرور آواز اٹھائے۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں مانگتے۔

ہم نہیں چاہتے کہ بھارت کبھی یہ بات ثبوت کے ساتھ کہہ سکے کہ پاکستان بھارت کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہا ہے حالانکہ وہ یہ کہتا رہے گا۔ اس کے باوجود کہ بھارت نے گذشتہ ۴۳ سال میں کبھی پاکستان کے اندرونی معاملات میں اپنی ٹانگ اڑانے سے گریز نہیں کیا۔ آج بھی پاکستان میں سندھ کی سرحد سے بھارتی مداخلت جاری ہے اس بات کے ثبوت بین الاقوامی سطح پر اخبار نویسوں نے جن کا تعلق بھارت سے ہے پیش کئے ہیں کہ "را" کروڑوں روپیہ سندھ میں افراتفری پھیلانے کے لئے خرچ کر رہی ہے اور سندھ میں بھارتی مداخلت روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ جتنا خون خرابہ ہو رہا ہے اس کے پس پردہ براہمن کا سازشی ذہن کارفرما ہے۔ پاکستان مخالف لوگوں اور تنظیموں کو کھلم کھلا امداد دی جاتی ہے۔

بے شمار سکھ بھارتی حکومت کی اسی سازش کا شکار ہیں بھارتی حکومت پیسہ خرچ کر کے سکھوں سے ایسی حرکتیں کرواتی ہے جو پاکستان کے مفادات کے خلاف ہوں۔

اس سلسلے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ مجھے یہ علم نہیں کہ پاکستانی آئین کے تحت پاکستانی باشندے ہمارے ساتھ کسی تنظیم میں منسلک ہو سکتے ہیں۔ یا نہیں؟ لیکن جو مسلمان غیر ممالک میں رہتے ہیں وہ میں دعوی سے کہہ سکتا ہوں کہ اس قانون کے پابند نہیں اور اگر غیر ممالک کے مسلمان ہماری مدد کریں تو بھارتی حکومت اخلاقی طور پر یا کسی بھی ضابطے کی رو سے اس پر معترض نہیں ہو سکتی نہ اس کا ذمہ دار پاکستان کو ٹھہرا سکتی ہے۔

سوال۔ آپ نے حال ہی میں امریکہ میں ایک انٹرویو کے دوران سردار سمرن سنگھ مان کو سکھوں کا نمائندہ تسلیم کیا اور انہیں بھارتی حکومت سے بات چیت کی اجازت بھی دی۔ پنجاب میں جو سکھ خالصتان کی جدجہد کر رہے ہیں اور بقول آپ کے جنہوں نے ہزاروں جانوں کی قربانی بھی دی ہے کیا آپ ان سے بات چیت کرنے اور نمائندگی کا حق لے کر سمرن جیت سنگھ مان کو یہ حق سونپنا جائز سمجھتے ہیں؟

جواب۔ مجھے سردار سمرن جیت سنگھ مان کی ذہنی اور جسمانی قوت پر پورا بھروسہ ہے انہوں نے تشدد اور مصائب و آلام کا ایک لمبا دور بھارتی جیلوں میں گزارا ہے اور اس بات پر سب متفق ہیں کہ وہ کوئی سودے بازی کر کے باہر نہیں آئے۔ میں ان کو ایک دور اندیش سکھ سیاست دان تسلیم کرتا ہوں جو سکھوں کے معاملات پر کبھی سودے بازی نہیں کر سکتا نہ ہی بھارتی حکومت کے پھیلائے کسی جال میں پھنس سکتا ہے وہ کبھی سکھ حریت پسندوں کے مفاد کے خلاف بات نہیں کریں گے۔

سوال۔ لیکن رائے عامہ کا احترام تو ہر تحریک میں لازم ہے؟

جواب۔ وہ رائے عامہ کی نمائندگی ہی کرتے ہیں۔

سوال۔ آپ کے خیال میں سکھوں کے مسئلے کا خالصتان کے علاوہ بھی کوئی حل ہے؟

جواب۔ میرے خیال میں تو آزاد اور خود مختار سکھ ریاست کا قیام ہی ہمارے

مسائل کا حل ہے اگر کوئی اس سے بہتر حل پیش کر سکتا ہے تو اس پر بات ہو سکتی ہے وہ آپ مجھے بتادیں۔

سوال۔ اگر خالصتان آزاد بھی ہو جائے تو اس کی بقا کیسے ممکن ہے جب کہ آج کی دنیا جو مسائل کا گھر ہے وہاں پہلے ہی چھوٹی مملکتیں اپنے بڑے ہمسائیوں سے خطرات محسوس کر رہی ہیں؟

جواب۔ ایک لمحے کے لئے اپنی نظریں ذرا دنیا کے نقشے پر دوڑایئے۔ 160 ممالک میں سے ایک تہائی ملک آپ کو ایسے ملیں گے جو مجوزہ خالصتان سے رقبے اور آبادی کے لحاظ سے چھوٹے ہیں لیکن وہ پوری شدت کے ساتھ آزادی کے مزے لوٹ رہے ہیں اور دنیا میں انہیں اہم حیثیت بھی حاصل ہے۔

سوال۔ ایسے کون سے ممالک ہیں؟

جواب۔ مثلاً بلجیم' ڈنمارک' کویت' اسرائیل لکسمبرگ' ہالینڈ' سنگاپور' سوئٹزرلینڈ' تائیوان وغیرہ وغیرہ۔ ایسے بے شمار ممالک موجود ہیں۔ آپ دیکھئے بھارتی پنجاب کی 17 ملین آبادی اپنی کچھ امتیازی خصوصیت کی بنا پر دنیا بھر اپنا الگ مقام رکھتی ہے۔ ایشیائی لوگوں میں آپ سکھوں کو بطور کاشتکار' اتھلیٹ' ڈاکٹرز' ماہر قانون اور فوجی بہترین خصوصیات کا حامل پائیں گے۔ پنجاب کو بطور آزاد ملک دیکھیں آبادی کے لحاظ سے اسے آسٹریلیا' آسٹریا' بلجیم ' ڈنمارک' ہالینڈ' نیوزی لینڈ' سویڈن اور سوئٹزرلینڈ پر برتری حاصل ہو گی اور خالصتان کے لوگوں کو آزادی کے بعد بنگلہ دیش' نائیجیریا یا انڈونیشیا جیسے حالات کا سامنا بھی نہیں ہو گیا کیونکہ معیشت اور مضبوط سماجی ڈھانچہ اور مستقبل میں آگے بڑھنے کی مکمل صلاحیت یہاں کے عوام میں پائی جاتی ہے۔

جغرافیائی اور تزویراتی لحاظ سے پنجاب کو دنیا کے نقشے میں ایک نظر انداز نہ ہونے والی مسلمہ اہمیت اپنی جگہ۔ پانچ میں سے تین دریا اس میں موجود ہوں گے۔

ستلج، راوی بیاس اور یہاں سے جنوبی ایشیائی گزرگاہ ہو گی جہاں اس کی سرحدیں پاکستان، کشمیر اور بھارت سے ملیں اور ہمالیہ، افغانستان، چین، نیپال اور تبت کو جانے والے مسافر یہاں سے ہی گذریں گے۔ خالصتان میں بیک وقت ہموار اور پہاڑی علاقہ موجود ہو گا۔ یہ سبز انقلاب کی سر زمین ہو گی جسے آپ ایشیا کے لئے خوراک کی ٹوکری کہہ سکتے ہیں۔ یہاں گندم، چاول، اور دیگر اجناس با افراط پیدا ہوں گی۔ آپ جانتے ہیں یہاں کھیتی باڑی کے لئے پانی کی مکمل سہولیات حاصل ہوں گی اور پنجاب کی گندم کی فصل مثالی ہوتی ہے۔

اب آیئے تعلیم کے شعبے کی طرف ہمارے پاس امرتسر، چندی گڑھ، لدھیانہ اور پٹیالہ میں بہترین یونیورسٹیاں موجود ہیں۔ ہمارے پاس بہترین ڈاکٹرز، انجینئرز، سائیسدان موجود ہیں۔ سڑکوں، شہروں پوسٹل سروس ریلوے کا شاندار نظام موجود ہے۔ یاد رکھئے مستقبل کا خالصتان نہ صرف پنجاب کو بلکہ دنیا کو بہترین انسانی خدمت مہیا کرے گا اور یہاں میں یہ بات بھی کہہ دوں گا کہ یہ جنگ اب ختم ہونے والی نہیں۔ سردار گنگا سنگھ کی نسل اگر آزادی کے خواب کو شرمندہ تعبیر ہوتا نہ دیکھ سکی تو کوئی بات نہیں، سردار کاہن سنگھ میرے بیٹے کی نسل آزادی کی لذت سے ضرور بہرہ ور ہو گی۔ ہمارے باپ گورو بند سنگھ نے ہمیں بہت پہلے کہہ دیا تھا۔

کوئی کسی کو راج نہ دے ہے
جو لے ہے نج بل سے لے ہے

کوئی کسی کو پلیٹ میں رکھ کر حکومت پیش نہیں کرتا جس میں آزادی حاصل کرنے کی طاقت ہو وہ ضرور حاصل کر لیتا ہے یہ جنگ جو ہماری نسل نے شروع کی ہے اس کا خاتمہ اگلی نسل پہ ضرور ہو گا اور ہمارے بچے آزاد ملک خالصتان کو دنیا کے نقشے پر ابھرتا ضرور دیکھیں گے۔

○

ورلڈ سکھ آرگنائزیشن' سکھوں کی کم از کم امریکہ کی سطح پر ایک مربوط اور منظم جماعت ہے جس میں زیادہ تعداد امریکہ میں موجود متمول سکھوں کی شامل ہے.........

اس تنظیم میں نامور سکھ دانشور' ڈاکٹر' انجینئر' سائیسدان اور صنعتکار شامل ہیں۔

اس تنظیم کی سرگرمیاں محدود ضرور ہیں لیکن بڑی ٹھوس اور جاندار بھی ہیں مثلاً یہ لوگ امریکہ میں پناہ کے لئے آنے والے ان سکھ نوجوانوں کی دامے درمے قدمے سخنے مدد کرتے ہیں۔ جو بھارت سے کسی طرح جان بچا کر یہاں پہنچ جاتے ہیں۔

اس طرح امریکی کانگریس اور سینٹ میں ان کی رسائی ہے اور یہ کوئی موقعہ ایسا نہیں چھوڑتے جب بھارت کے خلاف احتجاج سے چوک جائیں۔

ان کی کوششوں سے بھارت کے خلاف امریکی کانگریس اور سینٹ کئی قرار دادیں پاس کر چکی ہے۔

بھارت میں سکھوں پر ہونے والے مظالم کی رپورٹیں شائع کرنا' ہیومن رائٹس کو اس طرف متوجہ کرنا اور خالصتان تحریک کے لئے ہر ممکن وسائل مہیا کرنا اسی تنظیم کی کارکردگی ہے۔

ان دنوں بھارت میں انتخابات ہوئے تھے اور پنجاب میں 100 فی صد کامیابی ان جماعتوں کو ملی تھیں جنہیں خالصتان نواز حلقوں کی حمایت حاصل تھی۔ ڈاکٹر گورچرن سنگھ ڈھلوں پیشے کے لحاظ سے سائیسدان ہیں اور سیکرامنٹو میں رہتے ہیں وہ کمال شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے' ملنے ٹریسی تشریف لائے تھے جہاں ان سے بات چیت ہوئی میرا پہلا سوال بھی موجودہ صورت حال کے حوالے سے تھا۔

سوال۔ ڈاکٹر صاحب برصغیر کی تازہ صورتحال پر آپ کیا تبصرہ فرمائیں گے؟

جواب۔ برصغیر پاک و ہند پر جنگ کی جو فضا بھارتی سامراج نے مسلط کر رکھی

ہے۔ اس کا اندازہ عالمی سیاست پر نظر رکھنے والے ہر شخص کو پہلے ہی سے تھا۔ ہم ایک عرصے سے یہ بات کہتے آ رہے ہیں کہ بھارتی حکومت چاہے جتنا بھی جھوٹ بولے وہ سچائی کو ہمیشہ کے لئے نہیں دبا سکتی۔ بھارت میں اقلیتوں خصوصاً سکھوں اور مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم و ستم ہو رہا ہے وہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔ پہلے ہندو سرکار نے یہ واویلا کیا کہ پنجاب میں مٹھی بھر تخریب کاروں نے صورتحال کو خراب کر رکھا اور حکومت جلد ہی ان پر قابو پا لے گی۔ آپ کو شائد یاد ہو کہ مسز اندرا گاندھی نے ان تخریب کاروں کی تعداد دو اور ڈھائی سو کے درمیان بتائی تھی لیکن آپریشن بلیو سٹار میں ہی ہزاروں سکھوں کو موت کی گھاٹ اتار دیا گیا اور تب سے آج تک بھارتی حکومت سکھوں کا قتل عام جاری رکھے ہوئے ہے لیکن یہ ”تخریب کار“ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہے۔ اس دوران ایک اور شوشہ بھارتی حکومت کی طرف سے یہ چھوڑا گیا کہ خالصتان کا وجود صرف امریکہ' لندن' اور کینیڈا تک ہے لیکن آج ۱۹۹۰ء میں دنیا نے دیکھ لیا کہ اب تک ہماری لاکھ کوشش کے باوجود بھارتی حکومت نے کسی غیر جانبدار بین الاقوامی کمیشن کو پنجاب میں جا کر تحقیق کرنے کی اجازت نہیں دی۔

اس کے باوجود بہت سی بین الاقوامی اور غیر جانبدار ایجنسیوں کی رپورٹیں ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹیں ایسی سامنے آئی ہیں جنہوں نے عالمی ضمیر کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ حال ہی میں لندن سے لیبر پارٹی کا جو وفد گیا تھا اس کے سربراہ مسٹر میکس میڈن کی رپورٹ جو انہوں نے برطانوی دارالعوام کو پیش کی ہے نے بھارت کی موجودہ حکومت کو بھی ننگا کر کے رکھ دیا ہے یہی وجہ ہے کہ اب امریکن کانگریس اور سینٹ میں بھارتی حکومت کے خلاف بل پیش ہو رہے ہیں اور ایسی رپورٹیں سامنے آنے لگی ہیں جنہوں نے ہندوؤں کا اصل چہرہ دنیا کو دکھا دیا ہے۔

جیسے ”سافٹ ٹارگٹ“ سامنے آئی ہے جس میں کینیڈا میں بھارتی سفارت خانے

کی غیر اخلاقی اور مجرمانہ حرکتوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ اور قابل مصنفین نے ثابت کیا ہے کہ کس طرح بھارتی حکومت نے اپنے کالے کرتوت چھپانے کے لئے سکھوں کو بدنام کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جو حکومت کسی اقلیت کو بدنام کرنے کے لئے اپنے ہی ملک کی ائر لائن کو تباہ کر کے سینکڑوں بے گناہوں کی جان سے کھیل سکتی ہو وہ اپنے مذموم مقاصد کی بجا آوری کے لئے کہاں تک گر سکتی ہے یہ کوئی معمولی بات نہیں لیکن خدا جانے عالمی ضمیر کہاں سو گیا ہے کہ اسے کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اس حقیقت کے انکشاف پر یو این او میں بھارت کے خلاف باقاعدہ کیس کیا جاتا اور اسے عالمی عدالت انصاف کے کٹہرے میں لا کر دنیا کے سامنے کھڑا کیا جاتا لیکن آج کی دنیا مفادات کی دنیا ہے اور محض اپنے مفادات کے پیش نظر ہی اچھائی اور برائی کا تعین کیا جاتا ہے۔

وی پی سنگھ سرکار جب برسر اقتدار آئی تو دنیا کو یہی تاثر دیا گیا کہ یہ مظلوموں کی بڑی ہمدرد حکومت ہے لیکن اس کے برعکس جلد ہی ان کے جوہر کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ آج جس بہیمانہ طریق پر مقبوضہ کشمیر میں بے گناہ اور نہتے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ اور تخریب کاری کی آڑ میں جس طرح پنجاب میں سکھوں کا قتل عام ہو رہا ہے اس نے اس حکومت کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ یوں بھی مسٹر وی پی سنگھ اپنے عوام کی حمایت سے محروم ہونے لگے ہیں ان کے اپنے ساتھی ایک ایک کر کے انہیں چھوڑ رہے ہیں۔ بھارتی عوام غربت' بیماری' روزگار اور صحت کے سنگین مسائل سے دوچار ہیں۔ ان مسائل سے عوام کی توجہ ہٹانے اور اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لئے ہندو سرکار کے پاس صرف ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے کہ وہ پاکستان پر مسلسل الزام تراشی کرتے ہوئے بالآخر جنگ چھیڑ دے۔

آج سے پہلے تو بھارتی حکومت نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ پاکستان سکھوں کو ہتھیار اور ٹریننگ دے رہا ہے اب کشمیریوں نے اپنی آزادی کا نعرہ بلند کیا ہے تو

ان کے خلاف بھی اس الزام کی تکرار ہونے لگی ہے۔ شاید بھارت کے اندر چلنے والی آزادی کی دیگر تحریکوں کا سلسلہ بھی ادھر ہی جوڑا جاتا لیکن بھارت کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ ان تحریکوں کے جو مراکز ہیں ان کی سرحدیں پاکستان نہیں ملتیں ورنہ ان میں بھی پاکستان کا ہاتھ ہی نظر آتا۔

سوال۔ آپ کے خیال میں کیا بھارت پاکستان سے جنگ کرے گا؟ کیا اس کے بغیر دونوں ممالک اپنے مسائل کا حل تلاش نہیں کر سکتے؟

جواب۔ ہم نے پہلے ہی کہا ہے کہ پاکستان کا واسطہ ایسے دشمن سے ہے جس کے نزدیک اصول یا اخلاقیات کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور وہ اپنے مذموم مقاصد کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ جنگ مسائل کا حل نہیں ہے۔ دونوں کو اپنے عوام کے مسائل پر توجہ دینا چاہئے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ بھارت ہمیشہ کی طرح جنگ کی رٹ لگا رہا ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ ایسا کر گزرے۔

سوال۔ اس صورت میں آپ کا ردعمل کیا ہو گا؟

جواب۔ ہماری جماعت کی پالیسی واضح ہے ہم نے دنیا بھر کے سکھوں سے اپیل کر دی ہے کہ جنگ کی صورت میں وہ پاکستان کا ساتھ دیں ہمارا بھارت سے کوئی تعلق نہیں نہ ہی اب سکھ قربانی کے بکرے بنیں گے۔ اگر بھارت نے پاکستان پر حملے کی حماقت کی تو ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ بھارت کی اپنی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اور خالصہ فوجیں پاکستان کے خلاف جنگ میں حصہ نہیں لیں گی۔ دنیا بھر میں موجود سکھ لیڈر شپ نے بھارت میں اور دنیا کے کونے کونے میں موجود اپنی قوم کے جوانوں کو یہ ہدایات جاری کر دی ہیں۔ اس سلسلے میں ہماری کوئی دوسری رائے نہیں ہے۔

ساری دنیا کے سامنے منتخب رکن قومی اسمبلی سردار سمرن جیت سنگھ مان نے اعلان کیا ہے کہ جنگ کی صورت میں سکھ بھارت کے بجائے پاکستان کا ساتھ دیں یہی

ہمارا عہد ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تاریخ کسی قوم کو بار بار سنبھلنے کا موقعہ نہیں دیتی۔

سوال۔ سکھوں میں بے شمار اختلافات کے بعد یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی ایک مقصد یا مسئلے پر بھی متحد ہو جائیں گے؟

جواب۔ آپ کی بات ٹھیک ہے بظاہر بیرونی دنیا اور پنجاب میں سرگرم عمل خالصتانیوں میں گروپ بندی کا رجحان تقویت پکڑ رہا ہے اور ممکن ہے بھارتی انٹیلی جنس کے لوگ اس پر بہت خوش بھی ہوں کہ انہوں نے سکھوں کے درمیان اختلافات پیدا کر کے بڑی کامیابی حاصل کر لی ہے ایک جماعت دو حصوں میں بٹ گئی ہو لیکن بھارتی انٹیلی جنس یہ دعوی نہیں کر سکتی کہ ان میں کسی نے خالصتان مسئلے پر اپنا سٹینڈ بدل لیا ہو۔ یہ ضرور ہوا ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں بد گمانیاں پیدا کر دی گئی ہیں۔ آپ شیشے کے جتنے ٹکڑے کر لیں وہ شیشہ ہی رہے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ہمارے کامیابی ہے۔ بھارتی حکومت سے ہمارا سوال یہ ہے کہ ۸۴ء سے آج تک کیا وہ خالصتان کی حمایت کرنے والے کسی ایک سکھ کو بھی اپنا نقطہ نظر تبدیل کرنے پر آمادہ کر سکے ہیں؟ سوائے ان لوگوں کے جنہیں ایک منصوبے کے تحت بھارتی انٹیلی جنس نے ہماری صفوں میں داخل کیا تھا اور جواب پہچان ہو جانے پر نکل چکے ہیں اور کوئی کامیابی انہیں حاصل نہیں ہوئی۔ جب بھی کوئی تحریک شروع ہوتی ہے تو کچھ لوگ اس سے جذباتی طور پر بھی وابستہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے جذبات ٹھنڈے پڑنے لگتے ہیں اور بظاہر وہ گرم جوشی باقی نہیں رہتی اور دکھائی یہی دیتا ہے کہ جیسے تحریک کی حمایت میں کمی آنے لگی ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں آزادی حاصل کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری منزل دور ضرور ہے لیکن ہم اپنا آزاد وطن بہر صورت حاصل کر کے رہیں گے۔ دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے کوئی قوم ایسی نہیں ملے گی جس نے اگر غلامی کا طوق گلے سے اتارنے کا تہیہ کر لیا ہو اور اسے آزادی نہ ملی ہو یہ دور آزادی کا دور ہے غلامی

اپنی موت خود ہی مر رہی ہے۔ مشرقی یورپ' افریقہ جہاں بھی دیکھ لیں لوگ آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ جلد ہی دنیا کو احساس ہو جائے گا کہ جنوب مغربی ایشیا کے اس سامراج سے بھی لوگ نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں اور وہ ہماری مدد بھی کریں گے۔

امریکی سیاست میں دو سیاسی جماعتوں کو نمایاں مقام حاصل رہا ہے جن میں سے ایک ری پبلکن اور دوسرے ڈیموکریٹس ہیں۔

عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ ریپبلکن پاکستان سے متعلق نرم گوشہ رکھتے ہیں جبکہ ڈیموکریٹس کا رویہ پاکستان کے تئیں اتنا بہتر نہیں جتنا وہ بھارت کی طرف ملتفت رہتے ہیں۔

اس صورت حال کا پس منظر کیا ہے؟

اس سوال کا جواب فوراً تو نہیں دیا جاسکتا۔

لیکن---

ڈیموکریٹس کی طرف سے یہ استدلال ضرور پیش کیا جاتا ہے کہ وہ صرف جمہوری حکومتوں کو پسند کرتے ہیں جبکہ پاکستان اس معاملے میں بہت زیادہ خوش قسمت نہیں رہا۔ ہمارے ہاں جمہوریت اول تو رو رو کر آتی ہے اور جب آجائے تو پھر جمہوریت نواز سیاستدان اس کی وہ مٹی پلید کرتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔۔

سوا اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا کہ فوج دوبارہ زمام اقتدار سنبھال لے۔

ڈیموکریٹس کی طرف سے ری پبلکن پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ عموماً وہ تیسری دنیا کے ممالک میں ڈکٹیٹروں کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ ڈکٹیٹر اندر سے بہت کمزور ہوتے ہیں اور عموماً کسی نہ کی غیر ملکی طاقت کا سہارا انہیں درکار رہتا ہے۔

اور امریکن ری پبلکن ایسے کمزور حکمرانوں کو بہت پسند کرتے ہیں تاکہ ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکیں یہی وجہ ہے کہ وہ ان کی حمایت کرتے ہیں۔ بات کچھ بھی رہی ہو لیکن میری رائے ذرا مختلف ہے کہ پاکستان کے معاملے میں امریکن رویہ ہمیشہ متعصب رہا ہے۔

امریکن پاکستان سے بھارت کے مقابلے میں ہمیشہ امتیازی سلوک کرتے ہیں۔ جس کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

اس کی یوں تو بہت سی وجوہات ہوں گی ۔ لیکن ایک اہم اور انتہائی قابل توجہ وجہ ہماری کمزور سفارتکاری ہے۔

افسوس وعدوں کے باوجود آج تک ہم بین الاقوامی سطح پر اپنا کیس بھی ڈھنگ سے پیش نہیں کر سکے۔

اب ہمارا ایٹمی مسئلہ ہی لے لیجئے

اس مسئلے پر پاکستان پھر امریکہ کے نزدیک معتوب ٹھہرا ہے ہماری فوجی اور اقتصادی امداد بند کر دی جاتی ہے اور اس کے لئے کبھی کوئی ڈھنگ کا بہانہ بھی نہیں سوچا جاتا پاکستان کو برملا کہا جاتا ہے کہ یا تو اپنا پر امن ایٹمی پروگرام بند کر دو یا ہماری امداد سے ہاتھ دھو رکھو۔

یہ ہے اس امریکی سوچ اور طرز فکر کا تانا بانا جس کے تحت یکم اکتوبر ۱۹۹۰ء سے ہمیں آئندہ سال ملنے والی ہر قسم کی امداد پر پابندی لگادی گئی ہے۔

جو بحری جہاز کچھ جنگی سامان کے پرزے لے کر روانہ ہو چکے تھے انہیں کھلے پانیوں سے واپس بلالیا گیا ہے۔ پی ایل ۴۸۰ کے تحت ملنے والی اشیاء کی ترسیل بھی روک دی گئی ہے۔ وہ عالمی امدادی ادارے جو امریکی سرپرستی میں کام کرتے ہیں یعنی ورلڈ بنک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ انہیں بھی ہاتھ روک دینے اور شرائط سخت تر کر دینے کا اشارہ ملا ہے۔

عالمی سطح پر ان تمام ممالک کو جو پاکستان کے معاملے میں امریکی پالیسیوں کا اتباع

کرتے ہیں مشورہ دیا گیا ہے کہ اپنا ہاتھ کھینچ لیں۔ یہاں تک کہ پاکستان کے روایتی مسلمان دوستوں یعنی سعودی عرب' متحدہ عرب امارات اور کویت کی معزول حکومت جو بوجوہ ان دنوں عالمی امریکی پالیسیوں کے خلاف قدم نہیں اٹھا سکتے کو بھی ہماری جانب دستِ تعاون بڑھانے میں دقتیں پیش آرہی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوویت یونین کے خلاف تو امریکی سرد جنگ کا خاتمہ ہوگیا ہے لیکن اب پاکستان جیسا کمزور اور چھوٹا ملک اس شکنجے میں آیا ہے۔

پاکستان کا قصور اگر یہ ہے کہ اس نے ایٹمی میدان میں اس حد تک ترقی کرلی ہے کہ کسی وقت بھی پرزے جوڑ کر ایٹم بنالینا اس کے لیے کوئی بڑا مسئلہ نہیں اور تیسری دنیا کے کسی ملک کے پاس ایسی صلاحیت یا طاقت کا آجانا امریکہ کو گوارا نہیں تو پاکستان سے بہت پہلے یہ منزل بھارت' اسرائیل اور جنوبی افریقہ عبور کر چکے ہیں۔ بھارت کا ۱۹۷۴ء کا ایٹمی تجربہ ایک معلوم و معروف حقیقت ہے۔

اسرائیل کے بارے میں امریکی ماہرین اور ان امور پر نگاہ رکھنے والے اداروں کی رائے یہ ہے کہ وہ ایٹم نہیں ہائیڈروجن بم بنانے کی پوزیشن میں ہے اور جنوبی افریقہ کے بارے میں یہ بات ہر کسی کے علم میں ہے کہ اس نے اسرائیل کے تعاون سے کئی برس پہلے ایٹمی صلاحیت حاصل کرلی تھی۔ تو پھر صرف پاکستان ہی کو اس معاملے میں "سنگل آؤٹ" کیوں کیا جا رہا ہے۔ روایتی طور پر پاکستان روز اول سے امریکہ کا حلیف اور دوست رہا ہے۔

ماضی میں اس نے کمیونزم کی یلغار کو روکنے کے لئے' سوویت ایمپائر کی وسعت کو روکنے کے لئے کئی امریکی مہمات میں اس کا ساتھ دیا ہے۔ چین امریکہ تعلقات کو دشمنی سے دوستی میں بدلنے کے لئے پاکستان کا کردار بنیادی تھا۔ پوری عرب دنیا اور مسلم بلاک میں جب بھی امریکہ مخالفت اپنے زوروں پر تھی امریکیوں کو پاکستان کے ساتھ دوستی کا فائدہ حاصل تھا۔

پاک امریکہ دوستی ہمیشہ یکطرفہ ٹریفک رہی ہے۔ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے

ہمارا ملک جنوبی ایشیا کے مغرب میں واقع ہے۔ چین جیسے بڑے اور اہم ملک کا ہمسایہ ہے۔ مملکت روس کے جنوب میں اہم ترین غیر کمیونسٹ اور مسلم ملک ہے۔ عالم عرب کے دھانے پر کھڑا ہے۔

اس لحاظ سے اگر امریکہ کو کبھی اپنے عالمی اہداف کے حصول کے لئے پاکستان کی ضرورت پڑی ہے تو اس نے ہمیں فوجی اور اقتصادی امداد فراہم کی ہے۔ لیکن اگر پاکستان کو خالصتاً اپنے دفاع کی خاطر امریکی امداد یا تعاون کی ضرورت پڑی ہے تو امریکہ نے سرد مہری ہی نہیں دکھائی ہر موقع پر صریحاً انکار کیا ہے۔

۶۵ اور ۷۱ کی پاک بھارت جنگوں میں امریکی رویہ اور کردار اس کی واضح مثالیں ہیں۔ ہمیں جب بھی امریکی امداد ملی ہے اس کا مقصد پاکستان کے دفاع کو مضبوط بنانا یا اسے معاشی خود کفالت اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنا نہیں تھا بلکہ پاکستان کو امریکہ کے سب سے بڑے حریف سوویت یونین اور اس کے نظریۓ کمیونزم کے خلاف جنوبی اور مغربی ایشیا کی ڈھال کے طور پر استعمال کرنا تھا۔

سینٹو کے دفاعی معاہدے کا رکن ہمیں اس لئے بنایا گیا کہ مشرقی پاکستان کی وجہ سے ہمارا ملک چین کی جانب سے جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک پر کمیونزم کی یلغار کی روک تھام کر سکتا تھا۔ پہلے معاہدہ بغداد اور پھر سینٹو کی رکنیت کے "شرف" ہمیں اس لئے بخشا گیا کہ پاکستان، ایران ترکی اور شروع میں عراق سب ملکر عالم عرب اور مسلم بلاک کے اندر اشتراکیت اور سوویت یونین کے پچاس اور ساٹھ کی دھائی میں بڑھتے ہوئے اثرات کی روک تھام کر سکتے تھے۔

ان حالات میں امریکی امداد جو ہمیں ملتی تھی ہماری دفاعی ضرویات کی خاطر نہیں ہوتی تھی امریکہ مفادات کے تحفظ اور عالمی سطح پر امریکی اہداف کے حصول کے لئے ہوتی تھی۔

امریکی حکام اور پالیسی سازوں کا ذہن اس بارے میں ہمیشہ یکسو رہا ہے۔ انہوں نے کبھی بھی پاکستان کو پاکستان کی خاطر مدد نہیں دی۔ اگر اس بارے میں غلط فہمی کا

شکار ہوئے ہیں تو ہم ہوئے ہیں ہمارے پالیسی ساز ہوئے ہیں ہمارے حکمران اپنی اغراض اور کج فہمی کی بنا پر امریکی طرز فکر کو سمجھنے میں ناکام ہوئے ہیں۔ قصور اس میں امریکیوں کا کچھ زیادہ نہیں ہمارا اپنا ہے۔ ہمارے حکمران طبقے کا ہے۔ جسے اقتدار پر براجمان رہنے کے لئے پاکستانی عوام سے زیادہ امریکی حکام کی خوشنودی اور رضامندی کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ ورنہ امریکیوں کے بارے میں کسی کو اگر غلط فہمی تھی تو وہ ۱۹۶۵ء میں دور ہو جانی چاہئے تھی۔

۱۹۷۱ء میں جب ہمیں دولخت ہوتے دیکھ کر بھی امریکیوں کی "رگ دوستی" نہ پھڑکی تو ہمیں اس دوستی کی نوعیت بھانپ لینی چاہئے تھی۔ اس کے بعد بھی ہم اگر یہ توقع کرتے ہیں کہ امریکہ محض ہماری خاطر' ہر طرح کے حالات میں ہماری مدد کرتا رہے تو اس بارے میں ہمیں امریکیوں کو مورد الزام ٹھرانے کی بجائے بحیثیت قوم اپنے اجتماعی طرز فکر و عمل کے بارے میں غور کرنا چاہئے

○

امریکیوں کے یہاں دوستی کوئی پائیدار اور ہمیشہ کے لئے قائم اور برقرار رکھنے والی صفت نہیں ہے۔ بین الاقوامی سیاست میں تو در حقیقت ان کا مغربی یورپ کے ممالک اور اسرائیل کے علاوہ کوئی دوست ہے ہی نہیں۔

عالمی سطح پر انہوں نے کبھی دوست بنانے کی فکر نہیں کی اپنے مفادات کو آگے بڑھانے کے لئے ضرورت مند ملکوں کی تلاش کی ہے۔ جب تک یہ ممالک ان مفادات کی تکمیل میں.ان کے کام آتے رہتے ہیں وہ ان پر اپنی نوازشات کی بارش کرتے رہتے ہیں۔ یہاں کے حکمرانوں کے اقتدار کو قطع نظراس سے کہ انہوں نے فوجی وردی پہنی ہوتی ہے یا جمہوری لبادہ اوڑھا ہوتا ہے ہمیشہ تحفظ دیتے آئے ہیں۔

یہ مفادات جب پورے ہو جاتے ہیں تو امداد بھی بند اور اس ملک کے حکمران کے تحفظ کی ذمہ داری بھی ختم۔ اس کام کے لئے بہانہ تو ہر وقت کوئی نہ کوئی موجود

ہی ہوتا ہے۔ ۱۹۶۵ء میں جب ہماری امداد پر پابندی لگائی گئی تھی تو اس وقت پاکستان کون سے "ایٹمی پروگرام" پر امریکیوں کی مرضی اور پالیسی کے خلاف عمل کر رہا تھا جو ہماری ہر طرح کی فوجی اور اقتصادی ضرویات کی ترسیل بند کر دی گئی تھی۔

۷۷—۱۹۷۶ء میں پہلی مرتبہ ایٹمی پروگرام کے حوالے سے ہماری امداد روکی گئی تھی۔ ۱۹۸۰ء میں اسی صدر کارٹر نے افغانستان پر سوویت فوجوں کی یلغار کے نتیجے میں اپنے مفادات کو خطرے میں پایا تو چار سو ملین ڈالر کی پیشکش کر دی۔ مرحوم ضیاء الحق نے موقع اور حالات کو بھانپتے ہوئے اتنی رقم کو "مونگ پھلی کے چند دانے" کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

امریکی مجبور ہوئے کہ ۱۹۸۱ء میں تین اعشاریہ دو ملین ڈالر کی فوجی اور اقتصادی امداد سے ہمیں نوازیں ۔ پھر ۱۹۸۷ء میں اتنی ہی مزید رقم بلکہ چار ملین ڈالر کا آئندہ چھ سالوں کے لئے اضافہ کریں ۱۹۸۸ء میں سوویت فوجیں افغانستان کو خالی کر کے چلی گئیں۔

۱۹۹۰ء تک امریکہ سوویت دشمنی دوستی میں بدل گئی بقیہ رقم پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ "ایٹمی پروگرام" کا بہانہ تو موجود ہی تھا لہٰذا ہمارے امریکی سرپرستوں کو مزید عذر ڈھونڈنے کی حاجت پیش نہیں آئی۔ جن افغان مجاہدین کے جزبہ حریت کی امریکی اخبارات و رسائل اور وہائٹ ہاؤس کے افسران تعریف و توصیف کرتے نہیں تھکتے تھے وہ انہیں اب بنیاد پرست نظر آتے ہیں۔ گویا پہلے نہیں تھے اور جس پاکستان کی سلامتی کے تحفظ کو وہ اپنی خارجہ پالیسی کا "کارنر سٹون" قرار دیتے تھے' اس کی دفاعی ضروریات کے لئے بھیجے جانے والے فاضل پرزے لانے والے بحری جہازوں کو راستے ہی سے واپس بلا لیا گیا ہے۔

خارجہ پالیسی کے میدان میں امریکی پالیسی ساز منطق اور اصول کے نہیں تحکم کے قائل ہیں۔ امریکی قوم کے تحت الشعور میں جو سوچ پائی جاتی ہے اس کے تحت اس وقت کرہ ارض پر ان کی سپر طاقت کی "بادشاہت" قائم ہے۔ بادشاہت ہمیشہ اپنے مزاج اور طرز فکر و عمل کے لحاظ سے قوت اور دبدبے سے محکوم دنیا کو اپنی مرضی اور ارادوں کی تابع رکھنا چاہتی ہے۔ ان کا حوالہ وہ اس وقت دیتی ہے جب یہ اس کے ارادوں کی تکمیل میں اتفاقاً "گریس آئل" کا کام دیتے ہوں۔

اگر یہ ایسی کوئی خدمت سرانجام نہ دے سکتے ہوں تو وہ ان باتوں یا اصولوں کو ہر گز خاطر میں نہیں لاتی۔ ورنہ کیا معمولی سی حقیقت امریکی پالیسی سازوں کی سمجھ میں نہیں آئی کہ انہوں نے اس کو پوری دھائی میں افغانستان کے اندر اپنے مفادات کی خاطر پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے صرف نظر کیا۔ اسے آگے بڑھنے دیا۔

اس دوران پاکستانی فوجی اور اقتصادی امداد کی ہمارے ایٹمی پروگرام کی راہ میں رکاوٹ سمنگٹن ترمیم کے اپنے قانون کو بالائے طاق رکھا۔ کانگریس کو مطمئن کرنے کی خاطر صدر امریکہ ہر سال پریسلر ترمیم کے تحت اس مضمون کا سرٹیفکیٹ جاری کرتے رہے کہ پاکستان کے پاس کوئی ایٹم بم نہیں ہے۔ اس دوران امریکی جاسوسی اداروں کی اطلاعات کے مطابق پاکستان اپنے پروگرام پر پوری طرح عمل پیرا رہا۔

امریکی حکام اس سے قطعی بے خبر نہیں تھے۔ بس ان کا مفاد یہ تقاضہ کرتا تھا اس سے صرف نظر کریں سو انہوں نے اسے خوستہ و نخواستہ آگے بڑھنے دیا۔ اب خود امریکی اطلاعات کے مطابق یہ اس نقطے کو چھو گیا ہے جہاں سے پاکستان آسانی کے ساتھ اور جب چاہے گا پرزے جوڑ کر ایٹم بم بنا لے گا۔

اسے اس مقام تک پہنچانے میں امریکیوں نے گزشتہ دس سال تک بالواسطہ مدد دی ہے۔ وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے اب جو ہمارا ایٹمی جن بوتل سے باہر

نکل آیا ہے تو حکومت امریکہ کا ارشاد ہے کہ اسے واپس بھیجو۔ حضور کچھ تو عقل کے ناخن لیجئے کبھی ایسا بھی ہوا ہے۔ آپ پچاس کی دھائی میں روس کو ایٹم اور پھر ہائیڈروجن بم بنانے سے نہیں روک سکے تھے۔

ستر کی دھائی میں بھارت نے آپ کی ایک نہ سنی اور اب آپ پاکستان سے کیسے توقع رکھ رہے ہیں کہ وہ اپنے دفاع اور توانائی کی ضروریات کی خاطر اپنے ایٹمی پروگرام کو محض اس لئے ترک کر دے کہ آپ جیسا ناقابل اعتبار اور وقت اور ضرورت پر کبھی کام نہ آنے والا دوست اس کا تقاضا کر رہا ہے۔

۸۷۔ ۱۹۸۶ء کے موسم سرما میں جب بھارت براس ٹیک کے جنگی منصوبے کے تحت ہم پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا اس وقت یہ ہمارا ایٹمی پروگرام ہی تھا جس کی وجہ سے بھارتی حکومت اپنے ہاتھ روکنے پر مجبور ہو گئی تھی ورنہ آپ نے تو بھارتیوں کو اپنے قول و فعل کے ذریعے یہ ضمانت فراہم کر رکھی ہے کہ پاک بھارت جنگ کی صورت میں امریکہ پاکستان کی حمایت نہیں کرے گا اور غیر جانبدار رہے گا۔

○

ان حالات میں پاکستان کے پاس اپنے دفاع کی خاطر ایٹمی توانائی کے حصول کے علاوہ اور آخر کون سا طریقہ رہ جاتا ہے؟

شاید دنیا کو بھارت کی وہ "براس ٹیک" جنگی مشق نہیں بھولی ہوگی جب بھارتی فوج پاکستان کی سرحدوں پر جنگی مشقوں کی آڑ میں چڑھ آئی تھی تب بھارت کو اپنے خطرناک ارادے سے اگر کسی بات نے منع کیا تھا وہ پاکستان کا یہی ایٹمی پروگرام تھا۔

بھارتی صحافی کلدیپ نیر کے حوالے سے شائع ہونے والا پاکستان کے مایہ ناز سپوت ڈاکٹر خان کا انٹرویو جب بھارتی اخبارات میں چھپا اور ڈاکٹر خان کے حوالے سے یہ بات

سامنے آئی کہ اگر بھارت نے پاکستان پر جارحیت کی اور پاکستان کے پاس اور کوئی چارہ کار نہ رہا تو بادل نخواستہ وہ بھارت کے خلاف ایٹم بم ہی استعمال کرے گا۔

اس خبر کا چھنا تھا کہ بھارت کو اپنے گھناؤنے منصوبے خاک میں ملتے دکھائی دیے تو بھارتی فوج چھاؤنیوں میں واپس لوٹ گئی۔

اس بات کو دنیا کا ہر ذی شعور شخص جانتا ہے کہ مستقبل میں دنیا کا کوئی ملک اگر اس نے خودکشی کا ارادہ نہیں کر لیا تو وہ کبھی اپنے مخالفین کے خلاف ایٹم بم استعمال نہیں کرے گا۔

ایٹم بم ایک "ڈیٹرنٹ" ہے

اس کی موجودگی بھارت کو پاکستان پر حملے سے منع رکھے گی۔ کیونکہ بھارتی جانتے ہیں کہ پاکستان مجبور ہو کر ایٹم بم استعمال کرے گا اور دنیا کبھی یہ پسند نہیں کرے گی کہ دنیا کے کسی حصے میں ایٹم بم استعمال ہو اس لئے وہ بھارت پر دباؤ ڈالیں گے کہ وہ جنگ نہ کرے۔

○

یہی تھی وہ سوچ اور خیالات جن کے ساتھ میں نے امریکی ری پبلکن کی فارن افیر کمیٹی کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر لوسیئو سے ملاقات کی——

اس ملاقات کا اہتمام بھی سینٹ میں میرے کرم فرما گنگا سنگھ ڈھلوں نے کیا تھا۔ جن کے ری پبلکن اور ڈیموکریٹس دونوں سے بڑے اچھے تعلقات ہیں ڈاکٹر لوسیئو سینٹر جیسی ہیلمز کے دفاتر میں ہمارے منتظر تھے۔

سردار صاحب نے مجھے واشنگٹن کے یونین سٹیشن سے "وصول" کیا اور سیدھے ادھر ہی لے آئے۔

امریکہ میں "کار پارکنگ" پر کمال بڑے کمال کی بات ہے اور سردار صاحب کو اس پر مہارت تامہ حاصل ہے۔ کوئی نہ کوئی خالی گوشہ ان کی نظروں میں ہمیشہ رہتا ہے جہاں وہ سمجھتے ہیں کہ کارپارکنگ کو جگہ مل جائے گی۔

گو کہ اس سے پہلے بھی سردار گنگا سنگھ کی معیت میں متعدد مرتبہ میں کانگرس اور سینٹ کے دفاتر دیکھ چکا تھا اور ایک بات جو میرے لئے آج تک پریشانی کا باعث رہی ہے وہ ایک پاکستانی ہونے کے ناطے ہے۔

میرا خیال ہے امریکیوں کو اپنی سیکورٹی کی کوئی فکر نہیں۔

جی ہاں!

آپ بھی شاید میری بات سے متفق ہوں گے۔ ہمارے ملک کے ائرپورٹ دیکھئے جنگی قلعے نظر آتے ہیں۔

جہاز پر چڑھتے یا اترتے وقت دل کو یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر جہاز کو اپنے محاصرے میں لیے ہماری ائرپورٹ سیکورٹی کے شیر دل جوانوں میں سے کسی ایک کی انگلی کا دباؤ ٹریگر پر ذرا سا بھی پڑ گیا تو ایک آدھ بندہ اپنی جان سے گیا---!!

ہمارے بہادر جوانوں نے جہاز کو اس طرح گھیرے میں لئے ہوتا ہے کہ یا تو اس میں سے "دہشت گرد" برآمد ہونے والے ہیں۔ یا پھر سوار ہو رہے ہیں -----!!

ائرپورٹ میں داخلے سے جہاز میں سوار ہونے تک آپ کو اتنی مرتبہ تلاشی اور "جامہ تلاشی" کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے کہ خود پر خوامخواہ شک ہونے لگتا ہے کہ آخر اتنے ذمہ دار سیکورٹی کے اہلکار اتنے بے وقوف نہیں کہ وہ بار بار ہمارے سامان پر مہریں لگا رہے ہیں۔

کہیں کاغذ پر مہر چیک ہوتی ہے --- کہیں کاغذ کو پھاڑا جاتا ہے ---- ایک مشین پر اعتبار نہیں دو مشینوں سے سامان گزر رہا ہے۔

بار بار آپ چیک ہو رہے ہیں۔

آخر کوئی بات تو ہے---

○

ایک مرتبہ تو ایسا منظر دکھائی دیا کہ سر پیٹ لینے کو جی چاہا------- !!

لندن سے ایک پرواز پر میں اسلام آباد پہنچا تھا۔

پہلی مرتبہ تو آیا نہیں تھا اس لئے ہمارے سیکورٹی حکام کی یلغار کسی بھی پرواز پر میرے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔

میں جانتا تھا کہ یہ لوگ جو بین الاقوامی آمد کے سامنے ہاتھوں میں مختلف ناموں کے بلے کارڈ پکڑے کھڑے ہیں اور ہر اترنے والے مسافر کی آنکھوں کے سامنے اسے اس طرح لہراتے ہیں جس طرح گاڑی کی روانگی کے لئے گارڈ جھنڈی لہرایا کرتا ہے---

یہ سب لوگ مختلف ایجنسیوں کے "ہونہار ملازمین" ہیں جو اپنے اپنے "صاحب" کے حکم پر ان کے مہمانوں کو "ریسیو" کرنے آئے ہیں------

خفیہ پولیس ' کے ان اہلکاروں کی ہر ممکن یہ کوشش ہوتی ہے کہ یہاں موجود مسافروں کو ان کی اہلیت کا علم ہو جائے۔

بے چارے اس کے لئے بہت محنت کرتے ہیں۔

کبھی آپ کے نزدیک آکر آپ کو گھوریں گے۔

کبھی خوا مخواہ آپ کے سامان کے گرد چکر کاٹنے لگیں گے۔

کبھی آپ کے نزدیک سے خوامخواہ اس طرح گزریں گے کوئی ایسی حرکت کریں گے کہ آپ متوجہ ہوں۔

کیونکہ جب تک ان بے چاروں کی "اہمیت" آپ نہیں جان پائیں گے۔ ان کا

دبدبہ کیسے قائم ہو گا۔

"ٹوہر" کیسے بنے گا؟

اب ذرا مثال ملاحظہ کیجئے ایسے ہی ایک "صاحب بہادر" اپنا ٹوہر کس طرح دکھا رہے تھے۔ جسے دیکھ کر بے اختیار میرا ہاتھ اپنے ماتھے سے ٹکرا گیا۔۔۔

"صاحب بہادر" نے مخصوص انداز کی شلوار قمیص اور چپل پہن رکھی تھی اور "ریوالونگ بیلٹ" یعنی وہ بیلٹ جس پر مسافروں کا سامان جہاز سے اتار کر رکھا جاتا ہے اور وہ دائرہ میں چلتی ہے۔۔۔۔۔

یہ صاحب بہادر اس بیلٹ کے سنٹرل پوائنٹ پر کھڑے تھے۔۔۔!!

بیلٹ کے درمیان خلا میں کھڑے ہو کر کبھی وہ مسافروں کو عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگتے اور کبھی اس سامان کو جو اس پر چل رہا تھا۔۔۔۔۔۔

کبھی کبھی موج میں آتے تو درمیانی خالی جگہ پر چہل قدمی فرمانے لگتے۔۔۔۔۔۔

یہ برٹش ایرویز کی پرواز تھی جس سے غیر ملکیوں کا ایک ٹولا بھی شاید اپنے سفارتی فرائض سنبھالنے آیا تھا۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ میں نے اپنی گناہگار آنکھوں سے ان غیر ملکیوں کو ان "صاحب بہادر" کی کی ایسی محیرالعقول حرکات پر پہلے مسکراتے پھر قہقے لگاتے بھی دیکھا۔۔۔!!

خدا جانے سیکورٹی کا یہ کون سا انداز تھا۔

امریکن بڑے بے وقوف ہیں ۔۔

نہ تو انہیں اپنے جہازوں کی فکر ہے ۔۔۔

نہ اپنے حساس نوعیت کے مقامات کی ---

نہ ہی اس بات کی پروا کہ اگر انہوں نے رن وے پر کھڑے جہازوں کو مسلح گھیرے میں نہ لیا تو انہیں بم سے اڑا دیا جائے گا----

اب یہی دیکھ لیجئے ----

خاکسار امریکہ کے ایک سے دوسرے کونے تک متعدد مرتبہ امریکہ کی قریباً سات مختلف ائر لائنوں میں سفر کر چکا ہے۔

لیکن۔

ایسے بے وقوف لوگ ہیں کہ آج تک "ٹھونک بجا" کر میری تلاشی نہیں لی۔ صاحب میری بات ہی کیا --- میری آنکھوں سے سامنے گزرتے سینکڑوں مسافروں کو جانے دیا۔

کیا مجال جو ان کے جسم کو کسی نے انگلی لگا کر بھی دیکھا ہو----

صرف ایک مرتبہ سیاٹل کے ہوائی اڈے پر ایک کالی میم نے مجھے کہا کہ لوہے کی تمام چیزیں اس کے نزدیک رکھے پیالے میں ڈال کر اس دروازے سے گزر جاؤں ------

ایک مرتبہ "میامی" ائر پورٹ پر ایک گورے صاحب نے مجھ سے درخواست کی کہ اپنے ہاتھ بغلوں سے زرا بلند کر کے اس راستے سے گزروں درخواست جس ملتجی انداز میں کی گئی تھی اس کا اندازہ شاید آپ کبھی نہ لگا سکیں۔

خوامخواہ حیران رہنے کو جی چاہتا تھا۔

آج تک کسی نے ایک سے زیادہ مرتبہ "بورڈنگ کارڈ" نہیں دیکھا ----

دوسری مرتبہ بیگ نہیں کھلوایا ----

کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں کوئی مشتبہ یا دہشت گرد ہوں ۔ کبھی کسی ٹنشن یا عزت نفس کے مجروح ہونے کا احساس نہیں ہوا۔

یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ امریکیوں کو سیکورٹی کا علم ہی نہیں ـــــ

اس ضمن میں ایک لطیفہ یاد آتا ہے تو اپنی بے وقوفی یا سادہ لوحی کہہ لیجئے پر آج بھی ہنس دیتا ہوں۔

جب میں پہلی مرتبہ سینٹ میں گیا تو داخلے کے دروازے سے اندر آنے پر ایک سائیفر مشین لگی ہے۔ جس پر آپ کے ہمراہ جانے والا سامان گزارا جاتا ہے۔

میرے پاس ایک کیمرہ اور ایک ٹیپ ریکارڈر تھا ـــــ

اب ہمیں عادت تھی اپنے ملک کی ـــــ کہ صاحب کیمرہ اپنے پاس رکھیئے لیکن اس کے سیل "چیک ان سامان" میں رکھیئے ـــــ اس بات کی سمجھ آج تک نہیں آسکی کہ جو سیل مسافر کے ہینڈ بیگج میں تباہ کن ثابت ہوتے ہیں وہ "چیک ان بیگج" میں پہنچ کر خطرناک کیوں نہیں رہتے۔

میں نے سیل نکالے اور مشین کے سرہانے کھڑے "کالے صاحب" کو تھما دیے وہ خدا کا بندہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں

اس درمیان سردار گنگا سنگھ مسکراتے رہے۔

یا میری بدحواسی سے لطف اندوز ہو رہے تھے ـــــ

کالے صاحب' نے دونوں سیل پکڑے میرا شکریہ ادا کیا اور یہ کہہ کر لوٹا دیے کہ انہیں ضرورت نہیں۔

میں نے لرزتے ہاتھوں سے سیل تھام لیے اور یہی جانا کہ شاید میں اپنی بات سمجھا نہیں پایا۔

ہماری انگریزی ذرا ایسی ہی ہے ـــــ

اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ کیمرے سے تو سیل نکالے نہیں ـــــ!

ارے یہ کیا غضب ہو گیا ـــــ دل نے کہا ـــــ لو بیٹا اب تو پھنس گئے۔

یہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت (SUPER POWR) کا سینٹ ہے اور تم ان کی

آنکھوں میں دھول جھونکنے جا رہے ہو۔

میں نے سردار گنگا سنگھ کی طرف دیکھا اور کہا۔

"سردار صاحب انہاں نوں میری انگریزی دی شاید سمجھ نہیں آئی۔ ذرا دس دینا کہ کیمرے وچ وی سیل موجود نیں"----

گنگا سنگھ ڈھلوں نے میری بات کا ترجمہ سنجیدگی سے انگریزی میں کیا اور یک لخت دونوں سیکورٹی گارڈ اور سردار گنگا سنگھ قہقہ لگا کر ہنس دیے۔

میں ہونقوں کی طرح ان کا منہ دیکھنے لگا---!!

سردار صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "مہاراج بھاویں بم لے جاؤ---- پرواہ نہ کرو ---- ایہہ سرداراں تے پردھیاں نوں کجھ نہیں آکھدے"----

اب بات میری بھی سمجھ میں آگئی تھی۔

میرے تنے ہوئے اعصاب بھی ڈھیلے پڑنے لگے اور میں بھی مسکرا دیا---

دراصل "اعتماد" ہی کسی قوم کی عظمت پر دلالت کرتا ہے---

اور اعتماد اس قوم کے افراد کو حاصل ہوتا ہے جہاں "نظام" مضبوط بنیادوں پر استوار ہوں۔

جہاں فرد کو اطمینان ہو کہ کوئی اس کے سر پر لٹھ لے کر نہیں کھڑا۔ اگر وہ غلطی کرے گا تو اسی کا نقصان ہوگا۔ کیونکہ یہ زمین ' یہ ملک اس کا ہے۔ اور وہ اتنا ہی ذمہ دار اور محب وطن ہے جتنے اس ملک کے حکمران۔

بدقسمتی سے ہم اعتماد کی دولت سے محروم ہیں۔

بے اعتمادی ہمارے سسٹم کی بنیاد ہے----

ہم ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں---

اور اس شک کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔

بے بنیاد شکوک ہمارے قومی مزاج کا حصہ بن چکے ہیں۔ اور یہ کوئی صحت مند رویہ نہیں۔

بے بنیاد شکوک بے اطمینانی کا باعث بنتے ہیں اور انسان کو ذہنی مریض بنا کر رکھ دیتے ہیں۔

ہم ایک دوسرے پر اعتبار کرنے کو تیار ہی نہیں ---!!

کوئی شخص اگر بارسوخ ہے تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس پر کسی مرحلے پر کوئی "چیک" نہیں۔

لیکن---

عام پاکستانی "قابل اعتبار" نہیں ----

ہر محکمے کا اہلکار اسے شک کی نظروں سے دیکھتا ہے-----

ہم نے اپنے اداروں کے نصاب نہ بدلے----

انہیں جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کیا-----

اہلکاروں کی ذہنیت نہ بدلی -----

تو پھر خدا ہی ہمارا حافظ ہے----

○

ڈاکٹر لوسیٹر سے میں نے پہلا سوال پاکستان کی ایٹمی پالیسی کے حوالے سے کیا اور پوچھا تھا کہ آخر وہ اس بات پر اعتبار کیوں نہیں کرتے کہ ہمارا ایٹمی پروگرام پر امن ہے اور کوئی خطرناک عزائم نہیں رکھتے۔

اس کے برعکس ہمارے ہمسایے نے نہ صرف ایٹمی دھماکہ کیا بلکہ مسلسل اس سمت میں آگے بڑھ رہا ہے اور نیوکلیئر اسلحے کے ڈھیر لگاتا چلا جا رہا ہے---- اور وہ

آپ کے نزدیک پھر بھی ''معصوم'' ہے۔

ڈاکٹر لوسیٹو نے مسکراتے ہوئے فوم کا کپ میری طرف بڑھایا۔ یہ چائے انہوں نے خود تیار کی تھی کیونکہ امریکہ میں چپراسی نہیں ہوتے۔ یہ ''اعزاز'' بھی ہمیں ہی حاصل ہے کہ دفتر کے باہر جب تک چپراسی نہ بیٹھا ہو ہم خود کو افسر سمجھنے کو تیار ہی نہیں ہوتے۔

''اس غلط فہمی کا ازالہ کر لیجئے کہ ہم نے کبھی بھارت کے ایٹمی پروگرام کی حمایت نہیں کی نہ ہی اسے پسند کیا ہے۔ لیکن ابھی تک ہمیں اس بات کا ثبوت نہیں ملا کہ بھارت نے ایٹم بم تیار بھی کر لیے ہیں۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ہماری خارجہ پالیسی واضح ہے۔ ہم پاکستان کو اپنا دوست سمجھتے ہیں لیکن ہمارے ہاں ہر کام کا ایک طریق کار ہے جس سے ہمارے دوست بھی مبرا نہیں ---- پاکستان ''پریسلر ترمیم'' کی زد میں آتا ہے اور کسی بھی ملک کے ایٹمی پروگرام کو ناپنے کا ہمارے پاس یہی پیمانہ ہے۔ جو ملک پریسلر ترمیم کی زد میں آئے

ہماری حکومت اس کی امداد روک دیتی ہے۔

تو آپ کو اس بات کا یقین ہو گیا ہے افغانستان سے روسی فوجیوں کے نکلنے کے بعد کہ .... میں نے سوال ادھورا چھوڑ کر ڈاکٹر لوسیٹو کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں'' انہوں نے اعتماد سے کہا ---- ''ہم ایک سسٹم کے تحت کام کرتے ہیں اور ہمیں اپنے سسٹم پر اعتماد بھی ہے''۔

ڈاکٹر لوسیٹو! آپ کے خیال میں مقبوضہ کشمیر میں بھارت کا کردار کیا مہذب دنیا کے لئے چیلنج نہیں بن رہا؟ میں اگلا سوال کرتا ہوں۔

''ہاں! ہم ری پبلکن بھارت کے سری نگر میں کردار کو پسند نہیں کرتے سینٹر جیسی ہیلمز اس ضمن میں سینٹ میں کئی دفعہ تقاریر بھی کر چکے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دونوں ممالک نے شملہ سمجھوتے میں یہ بات طے کی ہے کہ اس مسئلے کو باہمی افہام و

تفہیم سے حل کرلیں گے---- انہیں ایسا کرنا چاہئے---

آپ نے حال ہی میں کویت میں دوسرا طرز عمل اختیار کیا ہے اور عراق کے غاصبانہ قبضے کے خلاف وہاں فوجیں اتار کر کویت کو آزاد کروا دیا ہے--- کیا بھارت بھی اسی سلوک کا مستحق نہیں ٹھہرتا؟

میں نے اپنی دانست میں ڈاکٹر کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا لیکن وہ اطمینان سے چائے کا گھونٹ حلق میں انڈھیل کر میری طرف متوجہ ہوئے۔

نہیں --- آپ کویت کی مثال یہاں منطبق نہیں کر سکتے۔ کشمیر کی حیثیت متنازعہ ضرور ہے لیکن وہ کسی آزاد ملک کا نام نہیں نہ ہی کسی ملک نے اس پر غاصبانہ قبضہ کیا ہے۔ ری پبلکن کے نزدیک اس مسئلے کا حل استصواب رائے ہے ۔ جو کشمیریوں کا حق ہے ہم اس سلسلے میں اپنے فرائض سے غافل نہیں ہیں

ڈاکٹر لومیٹو سے دو گھنٹے تک گپ شپ چلتی رہی---

میں نے محسوس کیا کہ وہ پاکستان کے لئے نرم گوشہ رکھتے ہیں لیکن امریکن کتنے ہی آزاد خیال سہی۔ بین الاقوامی معاملات میں کبھی اپنی حکومت کے نقطہ نظر سے اختلاف نہیں کریں گے۔

یہ اعزاز بھی خدا کے فضل سے ہمیں ہی حاصل ہے کہ ایک برسراقتدار جماعت کے وزیر موصوف جو اس پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہوکر سرآرائے سلطنت ہوتے ہیں اپنی ہی حکومت کی پالیسیوں میں پریس کے سامنے کیڑے نکالنے بیٹھ جاتے ہیں ۔

امریکن کانگریس اور سینٹ کے ہر باشعور رکن کو علم ہے کہ بھارت ناانصافی کر رہا ہے لیکن اس سلسلے میں امریکن انصاف کے تقاضوں کی پاسداری کرتے نظر نہیں آتے کیونکہ ابھی ان کا مفاد اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ وہ بھارت کو مجبور کر کے ہمارے کشمیری بھائیوں کو ان کا حق خود ارادیت واپس دلوانے میں مدد کرے۔ لہٰذا ہمیں اپنی حفاظت خود کرنا ہوگی۔ اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کے لئے بھی جو کچھ بن

پائے وہ بھی خود ہی کرنا پڑے گا۔

بھارتی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی اپنے وسائل اور بل بوتے پر خود ہی تیار رہنا ہوگا اور اس کے ساتھ امریکی امداد کو خاطر میں لائے بغیر اقتصادی خود کفالت کی منزل کو بھی پانا ہوگا۔

اس مقصد کی خاطر پہلا کام ہمیں یہ کرنا چاہئے کہ قبل اس کے کہ امریکہ فوجی و اقتصادی امداد کی بندش کے علاوہ ہمارے خلاف کوئی اور قدم اٹھانے کی سوچے ہمیں ایٹمی دھماکہ کرنے کا اعلان کر دینا چاہئے اور پوری دنیا کو یہ خبر دے دینی چاہئے کہ ہمارے پاس ایٹم بم موجود ہے۔

ہم جنوبی ایشیا کی دوسری ایٹمی طاقت ہیں۔ ہم ایک ذمہ دار باعزت اور خود دار قوم ہیں اس اٹم بم کو محض اس وقت استعمال میں لائیں گے جب ہماری قومی سلامتی بالکل خطرے میں پڑ جائے گی۔

کوئی طاقتور ملک ہم پر بلا جواز حملہ کر دے گا۔ ہم اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود روایتی اسلحے اور فوج کے ساتھ اس کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے تو اپنی زندگی بچانے اپنے ملک کی سلامتی کو برقرار رکھنے کے لئے یہ ہمارے پاس آخری چارہ کار کے طور پر رہے گا۔

امریکیوں کو بہت نزدیک سے دیکھنے کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ اس جرات مندانہ فیصلے کے بعد ہم پر کوئی عذاب آن پڑے گا---- آپ یقین جانیئے مہذب دنیا صرف طاقت کی زبان ہی سمجھتی ہے----!!!

ڈاکٹر ہیرالڈ ہڈسن چھنو کا شمار امریکی دانشوروں کی صف اول "میں ہوتا ہے اس کی ایک وجہ شاید ان کا شہرہ آفاق ٹی وی سلسلہ "ہیرلڈ ہڈسن چھنو سے بات چیت" ہے ڈاکٹر صاحب ۱۹۷۲ء سے امریکن ٹی وی سے وابستہ ہیں اور دینا کی قریباً تیرہ سو منتخب شخصیات جن کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں سے ہے کے انٹروویو کر چکے ہیں۔ جس شخصیت کو ڈاکٹر انٹرویو کے لئے منتخب کرتے ہیں اس کی شخصیت، علمی استعداد اور کارہائے نمایاں سے متعلق پوری تحقیق کی ذمہ داری بھی اٹھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی منتخب کردہ شخصیات کے انٹرویوز امریکی عوام میں علمی سطح پر خاصی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر چھنو کی شخصیت یوں تو ہمہ پہلو ہے اور زندگی کے بہت سے موضوعات پر انہیں ملکہ حاصل ہے لیکن عالم اسلام سے متعلق خصوصاً ان کے پاس ایک نرم گوشہ موجود ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ امریکہ اسرائیل کی خوشنودی کے لئے جس طرح عالم اسلام سے اپنے تعلقات کشیدہ کر رہا ہے وہ غلط پالیسی ہے۔ ڈاکٹر چھنو کی تین کتابیں دنیا میں ممتاز مقام رکھتی ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

1. Who's who in Entertainment.
2. Who's who in the East.
3. Who's who in the World.

سوال۔ ڈاکٹر چھنو سب سے پہلے میں آپ سے تعارف کروانے اور اپنے چینل

سے متعلق کچھ بتانے کی درخواست کروں گا؟

جواب۔ جہاں تک میرا تعلیمی پس منظر ہے میں نے جارجیا یونیورسٹی سے جغرافیہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی میرا موضوع جنوبی امریکہ کا ایک ملک بولیویا تھا۔ میں نے ۱۹۷۲ء سے ٹی وی انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا جو ہفتہ میں ایک بار ''ہیرالڈ چمنو سے بات چیت'' کے عنوان سے آج تک مسلسل نشر ہو رہا ہے میں نے آج تک قریباً تیرہ سو دنیا کی معروف ترین شخصیات سے انٹرویو کئے ہیں۔ ان میں ہر طبقہ فکر کے لوگ شامل ہیں۔

سوال۔ آپ نے جو انٹرویوز کا یہ سلسلہ شروع کیا اس کے پس پردہ مقصد کیا تھا؟

جواب۔ بنیادی مقصد تو یہ تھا کہ ٹیلی کمیونیکشن کی ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکی عوام کو باہر کی دنیا کے اکابرین سے متعارف کروایا جائے ان کے خیالات و افکار ہمارے عوام تک پہنچیں تاکہ ہم عمومی سطح سے اٹھ کر ایک بہتر اور فعال معاشرے کی تعمیر کے لئے کوشاں ہو سکیں جو ہم سے زیادہ بہتر اور منصفانہ بنیادوں پر قائم ہو۔

سوال۔ یہ تجربہ کیسا رہا؟

جواب۔ بہت شاندار اس سے میرے علم میں اضافہ ہوا اور علمی سطح پر بڑی طاقتوں کے باہمی تعلقات اور امریکہ کے دیگر ممالک سے تعلقات میں کارفرما محرکات کی نشاندہی بھی ہوئی۔ اسی درمیان مشرق وسطیٰ کے سیاسی حالات میں میری دلچسپی بڑھتی چلی گئی خصوصاً جب ریگن دور حکومت میں لیبیا پر میرے ملک امریکہ نے بمباری کی تو مجھے احساس ہوا کہ امریکہ میں ایک مخصوص لابی نے کس طرح عرب ممالک اور عالم اسلام خاص طور پر لیبیا کے خلاف بے بنیاد تعصبات کو ہوا دے کر معاملے کو اتنا سنگین بنا رکھا ہے۔

سوال۔ اس پر آپ کا ردعمل ایک سکالر کی حیثیت سے کیا تھا؟

جواب۔ میں بتا چکا ہوں کہ میں نے واقعات کی نوعیت کو پرکھا جانچا اور مجھے احساس ہوا کہ عالم اسلام کے خلاف امریکہ میں ایک مخصوص فضا پیدا کر کے نفرت کو ہوا دی جا رہی ہے اس کے بعد سے میری خصوصی توجہ مسلم مغرب تعلقات پر رہی ہے کہ

آخر مسلم دنیا سے مغرب کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟۔

ہم مسلمانوں کے متعلق کتنا علم رکھتے ہیں؟ کیا جانتے ہیں اور جو ہم جانتے ہیں وہ کس حد تک درست ہے اور یہ کہ مزید کیا کچھ جاننے کی ضرورت ہے مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنے دیجئے کہ مغربی دنیا جس میں امریکہ بھی شامل ہے کی عالم اسلام کے متعلق معلومات محدود اور ناکافی ہیں مغربی عوام کی ایجوکیشن کے لئے میں نے مسلم مشاہیر سے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا لیکن ابھی تک مجھے اپنے مقصد میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی اور بہت کچھ کرنا ابھی باقی ہے۔ جس کے لئے میں دن رات کوشاں رہتا ہوں۔ میرے خیال سے میں مغربی دنیا کو یہ احساس دلانے میں کامیاب ہو گیا ہوں کہ انہیں عالم اسلام کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اور اس ضمن میں مزید محنت کرنے کی ضرورت ہے آپ یوں کہہ لیجئے کہ میری نارمل تعلیم تو ۶۳ء میں جب میں نے ڈاکٹریٹ کی ختم ہو گئی تھی لیکن میری ان فارمل تعلیم ابھی تک جاری ہے خاص طور پر مسلمانوں سے متعلق اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تک میری معلومات محدود ہیں۔

سوال۔ عالم اسلام کے بیشتر مشاہیر سے انٹرویو کرنے کے بعد آپ کس اندازے پر پہنچے ہیں۔ آپ کے خیال میں امریکہ اور مسلم دنیا کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟

جواب۔ میری غیر جانبدارانہ رائے یہ ہے کہ مسلم دنیا کے ساتھ امریکہ کے تعلقات کچھ زیادہ اچھے نہیں ہیں آپ یوں کہہ لیجئے کہ اتنے اچھے نہیں ہیں جتنے انہیں ہونا چاہئے اور یہاں مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی باک نہیں کہ اس صورتحال حال کی ذمہ داری بھی امریکہ پر عائد ہوتی ہے۔

سوال۔ آپ کے خیال میں اس کی وجوہات کیا ہے؟

1 جواب۔ سب سے بڑی وجہ تو امریکہ کی حد سے بڑھتی ہوئی صیہونیت نوازی اور اسرائیل کی فلسطینیوں کے خلاف بے جا امداد ہے۔ یہاں میں وضاحت کرتا چلوں کہ میں یہودیت کو صیہونیت سے الگ خیال کرتا ہوں۔ اور یہ صیہونیت پروری ہمارے قومی مفادات اور روحانی ورثے سے براہ راست متصادم ہے۔ اس پالیسی کی وجہ سے امریکہ کو

میں راہ گم گردہ شمار کرتا ہوں۔ یہ اسرائیل کی صیہونی لیڈر شپ کا اثر ہے کہ ہم کوئی بامقصد منصفانہ پالیسی مشرق وسطی میں اختیار نہیں کر سکے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم سوچیں آخر ہم کس مقصد کے لئے اسرائیل کو اتنی امداد دے رہے ہیں۔ ہمیں سوچنا چاہئے کہ اس پالیسی کی وجہ سے کہیں ہم مشرق وسطی میں اپنے دوستوں سے ہاتھ ہی نہ دھو بیٹھیں۔ ہمارے اعلی ایوانوں میں اسرائیل نواز لابی موجود ہے جو ہمہ وقت اسرائیل کی خوشہ چینی میں لگی رہتی ہے۔

سوال۔ ڈاکٹر چیبر آپ نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ امریکہ کی حد سے بڑھی ہوئی صیہونیت نوازی کی وجہ سے اسلامی دنیا سے امریکہ کے تعلقات بڑی حد تک متاثر ہو رہے ہیں۔ ان حالات میں آپ امریکہ کو کیا مشورہ دیں گے کیونکہ مسلمان اور امریکی صیہونی ریاست کے قیام سے پہلے ایک دوسرے کے دشمن نہیں تھے؟

جواب۔ میں یہ نہیں کہتا کہ صرف صیہونیت نوازی ہی مسلمانوں کے ساتھ تعلقات میں حائل ہے۔ میرا استدلال یہ ہے کہ دیگر اسباب کے علاوہ یہ بھی ایک بڑا سبب ہے میرے خیال سے اچھے تعلقات نہ ہونے کی ایک وجہ ایک دوسرے کے نقطہ نظر میں اختلاف ہے۔ مغرب کا نقطہ نظر سیکولر ہے جبکہ مسلم دینا روحانی اقدار کی حامل ہے مغرب کو بھی روحانی اقدار سے استفادہ کرنا چاہئے۔ دیکھیں ہم امریکہ میں روحانی اقدار کی عدم موجودگی کی وجہ سے ابتری کا شکار ہیں۔ ہمارے پاس مادی اسباب کی کمی نہیں لیکن روحانی طور پر ہم کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو اپنی روحانی اقدار سے وابستہ رہنا چاہئے۔ امریکہ کا المیہ یہ بھی ہے کہ اس کا تعلیمی سسٹم مسلم اقدار کو سمجھنے میں ناکام رہا ہے اور مسلمانوں کے خلاف تعصبات کو ختم نہیں کر سکا۔ میری امریکی عوام سے اپیل ہے کہ مسلمانوں کے خلاف **متعصبانہ** رویہ ختم کر دیں۔ اپنا نقطہ نظر تبدیل کریں اپنی ذات کی اکائی ہی میں گم نہ رہیں اور "زینو فوبک" نہ بنیں۔ میں کچھ نہ سیکھنے کی ذمہ داری امریکن پر عائد کرتا ہوں۔ مسلمان ایک بلین کے قریب ہیں جو ایک بڑی اکائی بنتی ہے اس لئے میری کوشش یہ ہے کہ میں امریکنوں کو ایجوکیٹ کروں اس مقصد کے

حصول کے لئے مسلم مشاہیر کو ٹی وی پر لاتا ہوں تاکہ وہ مسلم دنیا کے متعلق بے خبر امریکیوں کو بتائیں۔

سوال۔ آپ نے کرنل قذافی اور یاسر عرفات سے بھی تفصیلی انٹرویو کئے ہیں ان دونوں شخصیات کے متعلق مسلم اور غیر مسلم دنیا میں مختلف رائے پائی جاتی ہے۔ آپ نے انہیں کیسا پایا؟

جواب۔ میں دونوں سے کچھ زیادہ شناسائی کا دعویٰ نہیں رکھتا۔ میں نے یاسر عرفات سے آدھ گھنٹے کا انٹرویو نشر کیا ہے۔ میں نے اسے بہت ہمہ گیر انسان پایا وہ مقناطیسی شخصیت کا مالک ہے اور مخاطب کو اپنی شخصیت کے سحر میں جکڑے رکھنے کے فن سے آگاہ بھی ہے اس نے مجھے تحفے میں ایک سٹیچو دیا تھا جو سامنے میز پر رکھا ہے اور میری تصویر بھی اس کے ساتھ ہے۔

مجھے لیبیا میں تین مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا۔ میں کرنل قذافی کی آئیڈیالوجی سے بہت متاثر ہوں۔ آخری مرتبہ میں گذشتہ سال اس سے ملا تھا جب لیبیا نے ہیومن رائٹس پر کانفرنس بلائی تھی۔ میں نے قذافی کی گرین بک پڑھی ہے اور لیبیا کی تاریخ سے بھی واقف ہوں۔ ۱۹۵۰ء میں وہ غریب ترین قوم تھی مگر آج وہ دنیا میں معاشی استحکام کے لئے اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ انہیں تعلیم اور صحت کی مفت سہولیات حاصل ہیں روزگار کے وافر ذرائع مہیا ہیں اور وہ خوشحال ہیں کرنل قذافی کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ عوام کا حق ہے ان پر کوئی احسان نہیں۔ اور میں اس کی اس سوچ سے بہت متاثر ہوں۔ میرے اندازے کے مطابق قذافی اپنے عوام میں بہت مقبول ہے۔ اس نے اپنے ملک میں ایسا نظام رائج کر رکھا ہے کہ وہاں کے عوام امور مملکت میں براہ راست حصہ دار بنتے ہیں اور یہ بہت اچھا اقدام ہے۔ مجھے قذافی کے بہت سے پروگراموں نے متاثر کیا ہے میرے خیال سے دنیا میں اب مزدور کو پارٹنر ہونا چاہئے میں خیال کرتا ہوں کہ وقت آگیا ہے جب اس نقطہ نظر کو دیگر ممالک بھی اپنائیں بشمول امریکہ کے کیونکہ امریکہ میں "اونر شپ" بہت کم افراد تک محدود ہے۔

میں نے حال ہی میں دنیا کے بڑے اکانومسٹ کو انٹرویو کیا ہے جس کا کہنا ہے کہ امریکہ کے ۴۰ فیصد اثاثوں پر ایک فیصد افراد قابض ہیں گو کہ قذافی کمیونسٹ نہیں ہے لیکن وہ سرمایہ دارانہ نظام کو منصفانہ نظام تسلیم نہیں کرتا۔ میں اس کے قریبی لوگوں سے ملا ہوں وہ سب لائق اور فعال ہیں میں پھر اس سے ملنے کا متمنی ہوں کیونکہ وہ فوجی فلسفہ تاریخ کو تسلیم نہیں کرتا اب سوشلزم کے زوال کی وجہ سے فوجی معیشت بھی زوال پذیر ہو گی۔ جاپان کے سٹاک ایکسچینج کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ امریکی خسارے کے بجٹ کا شکار ہیں۔ آپ کو نیویارک میں بے گھر لوگ ملیں گے۔

یہ دونوں لیڈر میرے لئے بہت دلچسپی کا باعث تھے اور میں ان سے حقیقی معنوں میں متاثر ہوا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کم از کم آدھا فلسطین ضرور فلسطینیوں کو مل جائے۔ یاسر عرفات کا راستہ بہت کٹھن ہے صیہونیوں کے تمام مطالبات تسلیم کر لینے کے باوجود ابھی تک اسے صیہونیوں کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔

سوال۔ ڈاکٹر چینر مسلم دنیا اور امریکہ کے معاشی تعلقات پر آپ کیا تبصرہ فرمائیں گے۔ کیا عام امریکی شہری کو اس بات کا احساس ہے کہ صیہونیت پروری کی امریکہ کو کتنی قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے اسرائیل کی خوشنودی کے لئے امریکہ نے لیبیا سے تعلقات منقطع کئے تو نقصان کس کا ہوا۔ اٹلی والے لیبیا سے چار ملین ڈالر کی تجارت کرتے ہیں۔ امریکہ نے اسرائیل کو خوش رکھنے کے لئے سعودی عرب کو فوجی سامان دینے سے انکار کیا تو نقصان کس نے اٹھایا؟ ۴۰ بلین ڈالر کا سودا برطانیہ سے طے پا گیا۔ اس دور میں جب امریکی معیشت کو بڑے خطرات کا سامنا ہے امریکی ایوان نمائندگان کس طرح امریکی مفادات کو محض اسرائیل نوازی کی بھینٹ چڑھا رہا ہے؟

دراصل پرو اسرائیل لابی کی گرفت کانگریس اور سینٹ پر بہت مضبوط ہے کانگریس مین اسرائیل کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے خوفزدہ ہیں کہ کہیں اس طرح اپنی ممبر شپ ہی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں لیکن اب امریکی عوام کو اپنا زاویہ فکر بدلنا ہو گا اور اگر آج امریکی ایوان نمائندگان نے صورتحال کی نزاکت کو نہ سمجھا تو مستقبل میں شاید

ہمیں اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑے۔

ڈاکٹر چمنو کی سوچ انفرادی نہیں۔ امریکہ کے حقیقت پسند انٹیلکچوئیل ایسی ہی سوچ کے مالک ہیں۔ مجھے بہت سے امریکن پروفیسروں' ڈاکٹروں' ماہرین معیشت و معاشرت سے ملنے کا اتفاق ہوا وہ لوگ اگر اسرائیل سے نفرت نہیں کرتے تو یہ بھی نہیں چاہتے کہ امریکہ اسرائیل نوازی میں اتنا آگے نکل جائے تو اس کی معیشت ہی کو خطرات لاحق ہونے لگیں۔

ڈاکٹر چھنو سے انٹرویو میری زندگی کا ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ اس انٹرویو میں مسلمان محقق پروفیسر جعفر حسین سید نے میری معاونت کی اور ان کی مدد سے ہی مجھے اس شہرہ آفاق شخصیت تک رسائی میسر آئی۔ جعفر حسین سید کا شمار بلاشبہ عالم اسلام کے ان گنے چنے سکالرز میں ہوتا ہے جو نام و نمود کی خواہش کے بغیر مشنری جذبے سے دن رات عالم اسلام کی خدمت کے لئے کوشاں ہیں۔ نیویارک کے ایک علاقے گرنیز کے ۲ کمروں کے اپارٹمنٹ میں رہنے والے پروفیسر سید کے کمرے میں جائیے تو آپ کو قدم رکھنے کی جگہ نہیں ملے گی یہاں ہر طرف کتابیں' اخبارات اور ٹائپ شدہ کاغذات بکھرے دکھائی دیں گے۔ پروفیسر سید کا خاص موضوع ''صیہونیت'' ہے اور بلاشبہ انہوں نے امریکہ جیسے ملک میں بیٹھ کر جہاں ایسے نازک موضوعات پر تحقیق کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اپنے کام میں کمال حاصل کیا ہے۔

صیہونیت کے موضوع پر جتنا کام پروفیسر جعفر حسین سید نے کیا ہے اگر اسے جمع کیا جائے تو ایک الگ کتاب خانہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ شاید ہی عالم اسلام کی کوئی ایسی قابل ذکر یونیورسٹی رہی ہو گی جس نے پروفیسر سید کی خدمات سے استفادہ نہ کیا ہو۔ ان کے ریسرچ پیپرز کی کاپیاں ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ اسلامی دنیا کے سفارت کاروں' سکالرز اور درسگاہوں کو بھجی جاتی ہیں لیکن میرے خیال کے مطابق پاکستان کا کوئی ادارہ اپنے اس پاکستانی محقق کی اہمیت سے شاید ہی آگاہ رہا ہو۔ اس کی وجہ ایک تو گھر کی مچھلی دال برابر والی کہاوت ہو سکتی ہے اور دوسری اہم وجہ شاید یہ بھی ہے کہ علمی سطح پر ہمارے

درسگاہوں کا رابطہ ابھی بیرونی دنیا سے قائم نہیں ہوا یا اگر ہوا بھی ہے تو کچھ اتنا زیادہ نہیں۔

ایک دور تھا جب غیر مسلم دینا تحقیق اور علم کے میدان میں مسلمانوں کی محتاج تھی اور اسلامی درسگاہوں پر غیر مسلم طلبا کا ہجوم جمع رہتا تھا۔ ایک یہ دور ہے کہ مسلمان اپنے جوہر قابل کو خود ہی نہیں پہچان پاتے۔ پروفیسر سید نے یہودیت اور صیہونیت پر مختلف موضوعات کے تحت تحقیق کی ہے اور ہر موضوع کا اپ ٹو ڈیٹ ریکارڈ اپنی ہمت سے فراہم کیا ہے ہمارے ہاں شاید بہت کم محققین کو اس بات کا علم ہو گا کہ مغربی دنیا میں جب آپ کسی خاص موضوع پر تحقیق کرتے ہیں خصوصاً ان سوضوعات پر جو غیر مسلم دنیا کی دکھتی رگ بھی ہوں تو بسا اوقات صورت حال اتنی سنگین ہو جاتی ہے کہ آپ کو اپنی جان کے لالے بھی پڑ سکتے ہیں۔

مغربی دنیا کتنی متعصب ہے اس بات کا اندازہ کرنے کے لئے نیویارک کی پبلک لائبریری کے "یہودی سیکشن" کا ایک دورہ ہی کافی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ کو لائبریری کے "صیہونی" حصے میں "حقوق داخلہ محفوظ ہیں" کی پابندی کے ساتھ جانا پڑتا ہے یہاں فوٹوگرافی کی اجازت نہیں۔

آپ کوئی بھی کتاب لائبریری سے نکلوانے سے پہلے ایک فارم پر کرتے ہیں جس میں اپنا نام مذہب قومیت موضوع تحقیق اور ایسے ہی بے شمار ذاتی نوعیت کے سوالات کے جوابات دینا ہوتے ہیں جس کے بعد ہی آپ کو مطلوبہ کتاب مل سکتی ہے۔ خیال رہے کہ یہاں آمدورفت کا مکمل ریکارڈ' آنے والوں کی سرگرمیوں سمیت کمپیوٹر میں محفوظ ہوتا ہے اور اسی ریکارڈ کی بنیاد پر یہودی انٹیلی جنس "موساد" کے فائل ترتیب پاتے ہیں۔ جن میں یہودیت پر تحقیق کرنے والے تمام غیریہودی سکالرز کا مکمل ریکارڈ رکھا جاتا ہے ان کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے اور اگر موساد کو یہ شک بھی ہو جائے کہ یہ شخص مستقبل میں صیہونیت کے لئے خطرات پیدا کر سکتا ہے تو اتنی صفائی سے اس کا صفایا کروایا جاتا ہے کہ کسی کو شک بھی نہیں گزرتا۔

یہ ہیں وہ حالات جن میں رہتے ہوئے پرفیسر سید جعفر حسین نے صیہونیت پر تحقیق میں کمال حاصل کیا ہے۔ اپنے کمترین وسائل کے ساتھ وہ دن رات اسی امر کے لئے کوشاں ہیں کہ کسی بھی طرح اپنی معلومات کا یہ ذخیرہ کمپیوٹر کو منتقل کر دیں تاکہ مستقبل میں اگر کبھی عالمی سطح پر مسلمانوں نے صیہونیت کی ریشہ دوانیوں کا جواب دینا چاہا تو انہیں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

○

علی الصباح اپنے گھر سے نیویارک سب وے کی ٹرینوں پر سفر کرتے ہوئے مختلف لائبریریوں کی خاک چھاننے نکل جاتے ہیں اور رات گئے کتابوں اور فوٹو سٹیٹ کا بوجھ اٹھائے واپس لوٹ آتے ہیں۔ رات دیر گئے تک ان کتابوں میں سے نوٹس لیتے ہیں اور پھر مختلف آرٹیکل تیار کر کے ان کی فوٹو کاپیاں اسلامی ممالک کی یونیورسٹیوں اور سفارت خانوں کو ارسال کرتے ہیں۔ آج کل نیویارک کے اسلامی دانشورانہ حلقوں میں ان کی تازہ ترین تحقیقی مضمون "مشرقی یورپ کی تبدیلیاں اور عالم اسلام" پر بحث عام سننے میں آتی ہے۔

ایک پاکستان صحافی کی حیثیت سے میں نے پاکستان کے اس جوہر قابل کا مختصر تعارف کروا دیا ہے میں یہی کر سکتا تھا۔ یہ ارباب بست و کشاد خصوصاً ان تنظیموں اور درسگاہوں پر منحصر ہے کہ وہ پرفیسر سید کی خدمات سے کس حد تک استفادہ کرتے ہیں۔

پروفیسر جعفر سید صاحب کی ریسرچ کا خصوصی میدان فلسطین ہے اور کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کے بعد سے جس طرح امریکہ اور اسرائیل نے ایک "خود ساختہ امن" کی طرف بے کس اور بے بس عربوں کا مارچ شروع کروا رکھا ہے اس صورت حال پر پروفیسر جعفر سید سے تفصیلی بات ہوئی۔ انہوں نے امریکہ کے اس نام نہاد امن منصوبے کے متعلق اظہار خیال اس طرح فرمایا۔

سرمایہ دارانہ' سامراجی' بے دین اور نام نہاد جمہوری مغرب میں اکثر الفاظ سے بھی ان کی معصومیت کا زیور سیاسی منفعت کے لئے چھین لیا جاتا ہے الفاظ کو سامراجی مفادات کا آلہ کار بنایا جاتا ہے نیز ان سے سامراجی ٹولہ کے ناپاک عزائم کی پردہ پوشی بھی کی جاتی ہے لفظ ''امن Peace'' مغربی امریکی سامراج کے ترکش کا ایک تیر ہے۔ اس پس منظر میں ' سامراج اور صیہونیت کے خلاف نبرد آزما طاقتوں و تحریکوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ آگہی حاصل کریں کہ سامراجی و صیہونی کس طرح اس لفظ امن کو اپنے مفادات کے حصول کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

قومی سطح پر استحصال کا ہدف طبقہ ' مجبور و محکوم عوام' استحصالی معاشرہ کو جب اپنا مقدر تسلیم کرلے۔ ظلم و جبر کے خلاف اپنی مزاحمت ترک کردے تو مقتدر طبقہ کے لئے معاشرہ پر امن ہو جاتا ہے آزاد دنیا کے سیاق و سباق میں (آزاد دنیا ' دوسری سامراجی عالمی جنگ کی سامراجی تخلیق۔ یو ایس وہ برتر طاقت ہے جس کے ارد گرد آزاد دنیا گردش کرتی ہے) یہ آزاد دنیا ان ممالک پر مشتمل ہے جو حریف سوویت یونین کے نظام کا حصہ نہیں ہے۔ کے جوزف مہی ہرش' کرسچن سائنس مانیٹر مئی ۲۸' ۱۹۸۷۔ جب آزاد دنیا کے ناچار و بے کس عوام اپنے قومی مفادات' و امنگوں کو سامراجی مفادات اور لوٹ کھسوٹ کے لئے غیر مشروط طور پر قربان کردیں تو اس وقت سامراجی اصطلاح میں آزاد دنیا میں امن قائم ہوتا ہے۔

یہ آزاد دنیا ہے کیونکہ یہاں دیو قامت تجارتی اکائیوں کو لوٹنے سے باز رکھنے کے لئے کوئی ہاتھ موجود نہیں ہے۔ آزاد دنیا کے عوام کے لئے یہ آزاد دنیا ایک غلام دنیا ہے جہاں ان سے قومی وسائل بزور شمشیر چھین لئے جاتے ہیں۔ اس عالمی ڈکیتی کو قائم رکھنے کے لئے امریکی حکومت ہر سال ۸۰ بلین ڈالر خرچ کرتی ہے (کتاب ۱۹۷۲ء میں لکھی گئی) سی۔ آئی۔ اے اور سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اس عالمی ڈکیتی کے لئے معاون اداروں کے طور پر کام کرتے ہیں۔

اسی لئے سامراجیوں کے لئے ناصر' سوکارنو' بن باللہ ' ہوچی من ' لومبا ''آزاد دنیا''

کے امن کے لئے خطرہ تھے۔ ان محب الوطنوں کا قصور صرف یہ تھا کہ انہوں نے مغربی امریکی سامراج اور ان کے علاقائی پٹھوؤں کو اپنے اپنے قومی وسائل کو لوٹنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے آزاد دنیا کے چند ممالک کو سامراجی پنجہ استحصال سے آزاد کرنا چاہا سامراج کے استبداد کو للکارا۔

سامراجی لغت میں ان محب الوطنوں کا یہ جرم ناقابل معافی تھا۔ اس لئے۔ یو این او کے چارٹر کی پرواہ کئے بغیر جو آج بھی کسی ملک کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کا مدعی ہے نام نہاد مہذب مغرب اور امریکہ نے آزاد دنیا کی ان بتوریوں کو ان محب الوطنوں کو سیاسی افق سے براہ راست اور بالواسطہ تخریبی کاروائیاں کر کے ہٹانے کی کوشش کی تاکہ آزاد دنیا میں دوبارہ سامراجی پٹھوؤں کو لا کر امن بحال کیا جائے۔

محب وطن سوئیکارنو کے ہٹائے جانے کے بعد ارض انڈونیشیا پر کیا گذری۔ امریکی تجارتی اکائیوں نے کس قیامت کی لوٹ مچائی اس کی نشاندہی اگست ۱۹۷۰ء کا وال سٹریٹ میگزین کرتا ہے ”مرکزی انڈونیشیا کا ہر انچ جہاں تیل موجود تھا۔ امریکی نے کھنگال ڈالا۔ ان کارپوریشنز میں اٹلانٹک رک فیلڈ (Atlantic Richfield) کال ٹیکس یونین آئیل کو ’گلف آئیل‘ ’کانٹی نسل آئل‘ کئی ایسی تیل کی کمپنیاں شامل تھیں ان کمپنیوں کی لوٹ کی گرفت میں مشرق بعید کا ۵۰ فی صد تیل تھا۔

آج مغرب اور امریکہ کے نزدیک ہر وہ غیرت مند لیڈر جو اپنی قوم کو ”آزاد“ دیکھنا چاہتا ہے وہ ”آزاد دنیا“ میں ”سامراجی امن“ کے لئے خطرہ کا باعث قرار پاتا ہے۔

ان محب الوطنوں نے قومی بقاء کے لئے ایک ایسا راستہ اختیار کیا ہے جو سامراج کے حق میں نہیں ہے۔ انہوں نے قومی وسائل مغربی و امریکی سامراجیوں کو بطور نذرانہ پیش نہیں کئے اور نہ ہی اس نام نہاد جنگ میں شریک ہوئے ہیں جو امریکی سامراج اپنے تخیلاتی حریف کے خلاف جاری رکھے ہوئے ہے۔

جعفر صاحب کیا اسرائیل کا کردار بھی اسی ضمن میں امریکہ سے ملتا جلتا نہیں ہے ؟

جواب۔ مشرق وسطی میں ”صیہونی امن“ کی تشریح کا نمائندہ شارح سابقہ امریکی

صدر کارٹر کو قرار دیا جا سکتا ہے اس کے نزدیک "پائیدار امن کی پہلی شرط' اس وقت پوری ہوتی ہے جس وقت صیہونی ریاست اسرائیل کے ہمسائے اس کو قبول کر لیں۔ امن کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ صیہونی ریاست حالت امن میں رہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مصر اور اردن اپنی اپنی سرحدیں صیہونی ریاست کے لئے کھول دیں۔ یہودیوں کو اپنے اپنے ممالک میں آمدورفت پر پابندیاں کم کر دیں' تجارتی و ثقافتی سطح پر تعاون ہو۔ تاکہ صیہونیوں مصریوں اور اردنیوں کے درمیان ایک دوسرے کے لئے افہام و تفہیم بڑھے جس کے نتیجے میں جنگ کی فضا ختم کی جا سکے یہ ہے وہ نظریہ جو ۱۶ مارچ ۷۸ء کو اپنے خطاب میں صدر جمی کارٹر نے پیش کیا تھا۔ اس قبیل کا دھوکہ دینے والا صیہونی امن کا نام ہے اور کچھ نہیں۔ مسلمانوں کے لئے بے عزتی' دست برداری اور محکومی ۱۸۸۰ء کی دہائی ہی سے جب صیہونیوں نے ارض فلسطین پر قبضہ جمانے کے لئے مختلف بہانوں سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے تو وہ ان ہی مقاصد کے تحت سرگرم عمل رہے ہیں۔ فلسطینیوں کی شدید مزاحمت کو کم کرنے کے لئے اپنے مکروہ و غاصبانہ عزائم کی پردہ پوشی کے لئے صیہونیوں نے ایسے ہی دلفریب نعرے وضع کرنے شروع کئے۔

امریکن اور یورپین صیہونیوں نے ارض فلسطین کی خرید و فروخت اس نعرہ کے ساتھ شروع کی کہ اس طرح فلسطینیوں کو ملازمت اور اعلے معیار زندگی کی ضمانت ملے گی۔ نیز صیہونی خرید اراضی کسی خود غرضانہ خواہش کی محرک نہیں ہے۔ صیہونی جذبہ ہمدردی' اور انسانیت پروری کی خوب تشہیر کی گئی پہلی عالمی جنگ میں یہ صیہونیوں کی سازش تھی جس نے فلسطین پر برطانوی قبضہ کے لئے راہ ہموار کی۔ اور پھر یہی صیہونی کمال ڈھٹائی سے مقبوضہ فلسطین کے فلسطینیوں کو پیش کش کر رہے تھے کہ اگر فلسطینی' صیہونی ریاست کے حق کو تسلیم کر لیں تو وہ برطانوی قبضہ کے خاتمہ کے لئے کوشش کر سکتے ہیں۔ صیہونیت کے نو آبادیات کش کردار کو بہت زیادہ ابھارا گیا۔ اور اصل عزائم کو چھپایا گیا۔

۱۹۴۸ء کی پہلی جنگ بندی اس لئے عمل میں لائی گئی کہ مسلمانوں کی پیش قدمی کو

معطل کیا جا سکے۔ اور اس اثنا میں ہارتے ہوئے صیہونیوں کی دوبارہ صف آرائی کی جا سکے۔ نیز امریکہ اور یورپ سے مزید فوجی اور افرادی امداد حاصل کی جا سکے۔ دوسری بار جنگ کا التوا اس لئے ہوا کہ صیہونی اپنی عددی کمزوری کی وجہ سے مزید پیش قدمی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

۱۹۵۶ء کی جنگ بندی اس لئے قابل قبول تھی کہ مصری فوجی طاقت کا شیرازہ فرانس اور برطانیہ (امریکی حلیف) کی مدد سے بکھیرا جا چکا تھا۔

۱۹۶۷ء کی جنگ بندی صیہونی توسیعی عزائم کی بار آوری کے بعد مسلط کی گئی۔ غزہ مغربی کنارا اور مشرقی یروشلم، صیہونی فوجی قبضہ میں تھے۔

۱۹۷۳ء کی جنگ بندی ایک طویل جنگ کے متحمل نہ ہونے کیوجہ سے قابل قبول قرار پائی۔ لیکن ان تمام جنگ بندیوں کو صیہونی امن پسندی کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا۔

اس تاریخی پس منظر میں، نام نہاد امن کی تشہیر امریکی فوجی پشت پناہی سے آزادی پسند تحریکوں پر ضرب کاری کے بعد ان حرکی طاقتوں کو صیہونی امن پر مجبور کرنا صیہونیوں کی مشرق وسطی میں ایک حکمت عملی ہے اس چال سے صیہونیت کا مقصد قطعی واضح ہے۔ اس کا پیغام غیر مبہم امن مسلمانوں کے علم میں ہونا چاہئے اور تسلیم کر لینا چاہئے کہ مشرق وسطی میں صیہونی ایک غیر مبدل حقیقت ہیں۔ سادات اس صیہونی پیغام کے جال میں پھنسنے والا پہلا مصری راہنما تھا۔ صیہونی حکمت عملی کی کامیابی کا طلوع اس وقت شروع ہوا جب سادات نے اعلان کیا "ماضی کے شعار کے برعکس اب ہمیں کسی بھی "امن فورم" کا مقاطعہ نہیں کرنا چاہئے امن سے ہماری پہلو تہی نے ہم سے آدھا فلسطین بعد ازاں مکمل فلسطین پھر سنائی اور آخر میں گولان چھین لیا۔

سادات کی کوتاہ نظر اسے تاریخ کا یہ سبق باور نہ کرا سکی کہ جارح اور قابضین "استبداد" طاقتوں کے سامنے گھٹنوں کے بل گرنا اور عدم مزاحمت کی راہ اختیار کرنا

ان جارح طاقتوں کے عہد کو طوالت اور بسا اوقات دائمیت بخشتا ہے۔

سادات نے صیہونی طاقتوں کے آگے سر جھکا کر اور کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں پر دستخط کر کے صیہونیت کو جن فوائد سے بہرہ ور کیا اس کا اندازہ گائڈیں رافیل کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

”پہلی بار ایسا ہوا کہ دریائے اردن کے منبع سے لے کر دریائے نیل کے منبع تک کا تمام علاقہ ”خطہ امن“ بن گیا یعنی کوئی للکار صیہونی غاصبانہ قبضہ کو للکارنے کے لئے موجود نہ تھی سنیائی' ایشیا اور افریقہ کے درمیان ایک واحد کڑی ہے جو پہلے ایک ”راستے کی دیوار“ تھی اب ایک ”پل کا کام دے رہی تھی۔

قاہرہ سب سے قریبی قابل رسائی دار الخلافہ تھا۔ تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ اسرائیل اس علیحدگی کی دیوار کو گرانے میں کامیاب ہوا اور عربوں سے اپنے جائز مقتدر ہونے کی سند حاصل کر سکا۔ پہلی بار جنگ کا نقارہ امن کے گیت الاپنے لگا۔ یروشلم میں مصر کے صدر نے اور اسرائیل کے وزیر اعظم نے عرب اسرائیل دوستی کے ایوان کا سنگ بنیاد رکھا۔

سادات یہ بھی بھول گیا کہ اگر عالمی نقشہ سے صیہونی ریاست کو حرف غلط کی طرح نہیں مٹایا جا سکا تو اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ مسلمانان عالم ایک مستقل مسلح مزاحمت نہیں کر سکے۔ صیہونی ریاست کا قیام ایک ننگی اور کھلی جارحیت کا نتیجہ تھا اور آج بھی اس کے وجود کی ضمانت' امریکہ اور مغرب فوجی اور سیاسی پشت پناہی ہے اس کا ایک فوجی بر تر طاقت ہونا ہے۔ اس سامراجی تخلیق کی بقا چونکہ صرف طاقت پر ہے اس لئے اس کے نیست و نابود بھی طاقت کے ذریعہ ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ صیہونی ریاست کے پاس نہ ہی اتنے وسائل ہیں اور نہ ہی اتنی افرادی قوت کہ وہ ایک مستقل مسلح مزاحمت کی کفیل ہو سکے۔ اسی مسلح مسلم مزاحمت کا امکان صیہونیت کے لئے ایک بھیانک خواب ہے اس مسلح مزاحمت کے خطرہ کو روکنے کے لئے کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کے دوسرے مرحلے کی تکمیل ضروری ہے

تا کہ دوسری مزاحمتی طاقتوں پی ایل او اور شام کو صیہونی امن کے کفن میں کفنایا جا سکے۔

جعفر صاحب بول رہے تھے اور میں حیرت سے ان کی طرف دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا کہ عالم اسلام کے ایسے دانشور کس طرح گوشہ گمنامی میں پڑے ہماری ملی بے حسی کا مذاق اڑا رہے ہیں پروفیسر جعفر کہہ رہے تھے۔

صیہونی سازشی ذہن بین الاقوامی اور مقامی سطح پر ناموافق عوامل کو ابھرتے دیکھ رہا ہے۔ امریکہ صیہونی ریاست کا سب سے بڑا نگہبان آج ایک نیم جان دیو ہے اس کا ایک ناقابل شکست عالمی طاقت کا طلسم پارہ پارہ ہو چکا ہے جاپان اور جرمنی کل کی ہاری ہوئی اقوام آج امریکی اقتصادی' جہان گیری پر ایک کاری ضرب لگا رہی ہیں ویت نام' لبنان اور خلیج کی کھائیاں اس کے فوجی سر پھرے پن کو نکیل ڈال چکی ہیں۔ ویت نام سے پسپائی کے بعد علاقائی سامراجی پٹھوؤں کی نگہبانی کا کام ناممکن ہو چکا ہے۔ فلپائین کا مارکوس اور ایران کا شاہ ایک قصہ پارینہ ہیں۔ قوم پرست اٹھان ان سامراجی پٹھوؤں کو ہڑپ کر چکی ہے امریکہ کا آزاد دنیا کا رکھوالا ہونے کا دعوی باطل ہو چکا ہے دنیا کی محکوم قومیں اسے فرانس اور برطانیہ ایسی سامراجی طاقتوں کا رکھوالا خیال کرتی ہیں۔ جنہیں امریکی سرپرستی نے پہلی اور دوسری عالمی سامراجی جنگ میں تباہ ہونے سے بچا لیا۔ اور آج بھی آزاد دنیا کی مجبور محکوم اقوام کی نظر میں امریکہ کی پشت پناہی کے بغیر فرانس اور برطانیہ ان اقوام کا اقتصادی و سیاسی استحصال نہیں کر سکتے۔ مشرق وسطی میں مسلمان مصر' شام' لیبیا' لبنان' عراق اور ایران میں فوجی و امریکی سامراج کی بالادستی کو کامیابی سے للکار چکے ہیں۔ (اگرچہ مصر دوبارہ امریکی مہرہ بن چکا ہے اور عراق کو جنگ کی دلدل میں پھنسایا جا چکا ہے) مقبوضہ فلسطین میں مسلمانوں کی نفرت امریکی اور صیہونی سامراج کے لئے روز افزوں ہے۔

پروفیسر جعفر سید کہہ رہے تھے۔

ان ناموافق حالات کا احساس' صیہونیوں کو خبردار کر رہا ہے کہ وہ اس زیر زمین

ابلتے ہوئے لاوے کو جو مسلمانوں کی نفرت کی صورت میں ابل رہا ہے زیادہ دیر تک نہیں روک سکتے۔ اگر صیہونی امن قائم ہو جائے تو وہ سکھ کا سانس لے سکتے ہیں۔ ایسا نام نہاد امن صیہونیوں کے لئے مغرب نواز علاقائی طاقتوں کے لئے امریکہ اور مغرب کے لئے بہت زیادہ مفید ثابت ہو گا۔ یہ صیہونی امن' مسلمانوں میں نفاق کے بیج بوئے گا۔ محب الوطن تحریکوں میں ابتری پھیلے گی علاقہ میں موجودہ سیاسی توازن کو قائم رکھا جا سکے گا جو آج بھی امریکہ اور مغرب کے حق میں ہے۔

اس تجزیہ کی روشنی میں صیہونی امن کا تسلط مسلمانوں کی سیاسی موت ہے کیونکہ مسلمان صرف مسلم مزاحمت کا راستہ اختیار کر کے ہی فلسطین کو آزاد کرا سکتے ہیں (اور یہ روشن مثال کشمیری' چچنی' فلپینی اور ہندوستانی مسلمان بھی دہرا سکتے ہیں) لیکن اگر آج فلسطینی مسلمان سامراجی اور صیہونی "امن" کا طوق اپنے گلے میں پہن لیتے ہیں تو آنے والی نسلوں کے لئے صیہونی استبداد سے چھٹکارا پانا بہت مشکل ہو جائے گا لیکن میں مایوس نہیں ہوں کیونکہ میرا ایمان ہے کہ جیالے مسلمان آزادی کی قیمت دینے کے لئے تیار ہیں وہ صرف مغرب نواز مسلم حکومتوں کا منہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ کب اپنا مجاہدانہ کردار ادا کرتی ہیں جن کی بہترین مثال کشمیری مسلمان ہیں۔

فلاڈلفیا سے ہم نیویارک جا رہے تھے ------!

طاہرہ گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی۔ اور میں ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے اس کے ساتھ والی سیٹ پر اس کے دائیں ہاتھ بیٹھا تھا---

پچھلی سیٹ پر رابعہ نے ادھم مچا رکھا تھا۔ جب تک رابعہ اور نمیر جاگتے رہیں زندگی بیدار رہتی ہے۔

جیسے ہی انہیں اونگھ آئے۔

جیسے زندگی کو نیند آجاتی ہے۔

تب سڑک کے دو رویہ لگے درخت اور مناظر زندہ ہونے لگے تھے۔ کیونکہ اپنی بیداری کے درمیان دونوں سوائے اپنے اور کسی کی طرف میری توجہ مبذول نہیں ہونے دیتے۔

"بن فونیکلن برج" پر طاہرہ کی سوبرو کاروں کے سمندر میں پھسل رہی تھی اور ننھی رابعہ "لندن برج اس ہینگنگ اور پھر جنگل بیل جنگل بیل" سنا رہی تھی۔

جیسے ہی میں طاہرہ کی کوئی بات سننے کے لئے اس کی طرف متوجہ ہوتا نمیر جو اپنی ننھی سیٹ میں پھنسا کھڑا ہوتا رابعہ کو چھیڑ دیتا اور وہ فوراً سراپا احتجاج ہو کر مجھے مدد کے لئے پکارنے لگتی۔

دونوں کی معصوم شرارتیں، شوخیاں زندگی کے ان یادگار لمحات میں سنگ میل بنتی جا رہی تھیں۔

نیو جرسی ٹرن پائیک میں گھستے ہی رابعہ نے آہستہ سے آگے ہاتھ بڑھا کر مجھے ٹھوکا دینا شروع کر دیا تھا اور میں اس کے مخاطب کرنے کے اس معصوم انداز کا مطلب بخوبی جانتا تھا۔

"اگلی سروس پر گاڑی ذرا روک لینا"۔ میں نے طاہرہ سے کہا

"کیوں---؟ اس نے حسب معمول پوچھا۔

"ذرا ستا لو --- نیو یارک میں ڈرائیونگ کرنا بچوں کا کھیل نہیں" میں نے اسے حسب سابق جواب دیا۔

"اس کے علاوہ تو کوئی بات نہیں"--- اس نے ہائی وے پر نظریں جماتے ہوئے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"اس کے علاوہ تمہاری کوئی بات نہیں" میں نے جواب دیا۔

"انکل کہیں آپ دونوں کی بحث میں سروس ایریا نہ نکل جائے"۔ رابعہ نے ہمارے سوال جواب کے درمیان مجھے حالات کی سنگینی کا احساس دلایا۔

"چپ کر موٹیے مینوں پتا اے توں کس مصیبت دا شکار ایں"--- طاہرہ اپنی بیٹی کو بڑے پیار سے ڈانتی ہے۔

ہم اب سروس ایریا میں داخل ہو رہے تھے۔

سروس ایریا آپ کو امریکہ میں ہائی وے کے کنارے ہر پانچ دس میل کے فاصلے پر ضرور مل جائیں گے۔

سنتے ہیں کہ شیر شاہ سوری نے جی ٹی روڈ کے ساتھ ساتھ مسافروں کے ستانے کو آرام گاہیں اور سرائیں بنائی تھیں اب تو ان پر "قبضہ گروپ" قابض ہو گا جنہوں نے انہیں ملٹی نیشنل کمپنیوں یا پلازوں کا روپ دے کر دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹی ہو گی۔

لیکن-----

میں امریکہ کے ان "سروس ایریا" کو دیکھ کر سوچا کرتا ہوں کہ تمام مسلمان

بادشاہ بے وقوف نہیں تھے۔ انہیں بھی مستقبل کی ضرورتوں کا ادراک ضرور رہا کرتا تھا۔ یہ الگ بات کے آج ہم زیادہ عقلمند بن گئے ہیں اور صرف "حال" کے متعلق ہی سوچتے ہیں کہ جس طرح بھی ممکن ہے آج جی بھر کے موج میلہ کر لیا جائے۔ کل کس نے دیکھنا ہے۔

○

ان "سروس ایریا" میں سفر سے متعلق ہر ممکن سہولت موجود ہے--- پینے کے لئے ہمہ اقسام شرعی اور غیر شرعی مشروبات کے علاوہ کھانے ستانے اور تازہ دم ہونے کی تمام سہولیات میسر ہیں۔

"سروس ایریا" میں "PIZZA HUT" دیکھ کر رابعہ کے ساتھ ساتھ مجھے بھی خواہ مخواہ بھوک محسوس ہونے لگی اور تھوڑی ہی دیر بعد ہم سب قطار میں لگے تھے

ہم "ویجیٹرین پیزا" کے سلائس کاغذ کی پلیٹوں میں ہاتھوں پر رکھ کر باری باری اس موٹی سی بینگر و عورت سے اس طرح وصول کر رہے تھے جیسے ہمارے ہاں فقیروں میں خیرات بانٹی جاتی ہے۔

اپنے کالے ہونٹوں پر گہری سرخ رنگ کی لپ سٹک لگائے اور پیلے اور سرخ پٹوں والے لباس میں ملبوس موٹی بینگرس ہم میں سے ہر ایک کو بے نیازی کا انداز لیے ایک نظر دیکھتی اور پیزا کاغذ کی پلیٹ میں رکھ کر ہمارے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ کر "گڈ ڈے" کہہ کر اپنے موتیوں جیسے چمکدار دانتوں کی نمائش کرنے لگتی-----!

امریکی بچوں کی طرح رابعہ کی ڈیمانڈ بھی ہمیشہ "ایکسٹرا چیز" Chees کی ہوتی ہے جبکہ نمیرا ابھی تک پاکستانی ہے اور ہماری طرح موشروم اور تھوڑی "چیز" پر قناعت کر لیتا ہے۔

اپنی اپنی نیاز ہتھیلیوں پر جمائے ہم زمین میں دھنسی میز اور اس کے گرد دائرے میں نصب گول کرسیوں پر ٹک گئے۔

طاہرہ سرخ مرچوں ' گارلک پاوڈر اور سالٹ کی بوتلیں اٹھا لائی. تھی اور میں پیزے کے اس ٹکڑے کو "سپائسی" بنانے کے چکر میں اس وقت تک سرخ مرچوں کا چھڑکاؤ کرتا رہا جب تک کہ مجھے یقین نہ ہوگیا کہ اب ضرور پیزا کھاتے ہوئے میرے منہ سے "سوں سوں" کی آوازیں نکلیں گی---

رابعہ نے میری چوائس کا "لیمونیڈ" پہلے سے گاڑی میں رکھ لیا تھا جو عموماً ایسے ہی موقوں پر میرے کام آیا کرتا ہے-----

ہمارے اردگرد سینکڑوں لوگ اس بڑے ہال کے مختلف کونوں میں جہاں امریکن "فاسٹ فوڈ" اور "سی فوڈ" کے سٹال سجے تھے ساری دنیا کے غموں سے بے نیاز کھانے میں مگن تھے-----!!

ہم اکثر اپنے شادی بیاہوں اور ضیافتوں کے دیگر مواقع پر اس بات کے شاکی رہتے ہیں کہ ہم بے تحاشہ کھاتے اور ضائع کرتے ہیں۔

لیکن-----!

امریکیوں کو اگر آپ کھاتے دیکھ لیں تو اپنا خیال بدلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ کسی بھی فاسٹ فوڈ پر چلے جائیے ہر شخص اپنے سامنے رکھے ٹرے میں اشیائے خورد و نوش کا ڈھیر لگائے بیٹھا ہے۔ جتنی کھانے پینے کی اشیاہیں اتنے ہی نپکن بھی ساتھ رکھتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد جب طبیعت سیر ہو جائے گی تو ٹرے پر رکھا سارا کھانا اور پینا "ٹریش" ہو جائے گا اور ٹرے ایک سائیڈ پر رکھ دی جائے گی مجھے کچھ خاص اندازہ یا دعویٰ تو نہیں۔

لیکن----

میرا دل کہتا ہے کہ اگر وہ سارا فوڈ جو ایک دن میں "امریکی کینیڈا نلڈ" "رائے

رو جرز" "ہارڈی" برگر کنگ اور "ٹاکو بیل" ہی میں "ٹریش" کر دیتے ہیں وہ اتنی مقدار میں ہوتا ہے کہ اس سے ساری نہیں تو آدھی دنیا کے بھوکوں کا پیٹ بخوبی بھر سکتا ہے۔

ایتھوپیا کا قحط ختم ہو سکتا ہے۔

تیسری دنیا کا ہر باشندہ پیٹ بھر کے کھانا کھا سکتا ہے۔

خواتین و حضرات! ہم کیا کھانا ضائع کرتے ہیں کھانا تو امریکن کھاتے ہیں کہ کھانے کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

○

نیویارک کی طرف رینگنے والوں کے سمندر میں طاہرہ بڑے اعتماد سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔

دونوں بچے اپنی سیٹوں پر خراٹے لے رہے تھے——!

میں سڑک کے دو رویہ درختوں کی قطار اور ان کے پیچھے موجود درختوں کے سلسلوں میں بھٹکنے لگا——

سارے درخت شاہ ملبوط کی طرح لامبے اور گہرے سبز رنگ کے تھے کیا مجال کہ ان پر کہیں گرد یا دھواں جما ہو—— خدا جانے سارے جہاں کا گرد اور دھواں ہمارا ہی نصیب کیوں بن گیا ہے۔

جتنی کاریں سارے لاہور میں چیختی چنگھاڑتی ہیں صرف بروک لین میں اس سے زیادہ کاریں رینگتی ہوں گی۔

لیکن——!

ان کے سائیلنسروں کی چنگھاڑیں نہیں گونجتی' دھواں نہیں نکلتا خدا جانے یہ دھواں کہاں منجمد ہو جاتا ہے۔ دھواں شاید امریکنوں کے اندر جمتا رہتا ہے اسی لئے تو

امریکن بہت روتے ہیں-----!

کوئی خوشی کا موقعہ ہو کوئی غمی کا موقعہ ہو--- رونے لگتے ہیں----- اپنے اندر کے غبار کو ہلکا کرنے کے لئے نکالنے کے لئے۔ اگلی سڑکوں پر ٹریفک کا حال جاننے کے لئے شاید طاہرہ نے کار ریڈیو کا کوئی بٹن دبایا تھا جب اچانک ہی ایک گیت نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا

I am alian

I am englishman

I am stranger in newyork

یہ لائنیں بہت دیر تک میرے دماغ میں گونجتی رہیں چونکہ میں اس سے پہلے بھی دو تین مرتبہ نیو یارک یاترا کر چکا تھا اور جانتا تھا کہ یہاں کی سڑکوں پر انسانوں کے ریلے میں ایک اجنبی کے احساسات کیا ہو سکتے ہیں!!

طاہرہ نے دوسرا سٹیشن بدلا!

کوئی گہری اور پرسکون آواز والی مغنیہ کہہ رہی تھی۔

"OPEN YOUR WINGS AND FLY"

اور مجھے یاد آرہا تھا بچپن سے اپنے لاشعور میں بیٹھا وہ گیت

چل اڑ جا رے پنچھی کہ اب یہ دیس ہوا بیگانہ

بس یہی فرق ہے ہمارا اور امریکنوں کا---

امریکن اپنے پر کھول کر فضاؤں میں اڑنے پر تلے ہیں اور دوسری طرف ہم ہیں ہماری شاعری ہے کہ جو ع اڑنے بھی نہ پائے کہ گرفتار ہوئے ہم ---- یا پھر ذرا سی پرواز پر ہی پنچھی کو دیس بیگانہ ہونے پر ہجرت کا نوحہ الاپنے لگتے ہیں کیا خوب انداز پرواز ہے ہمارا بھی-----

○

ہماری کار ہالینڈ ٹنل میں داخل ہو رہی تھا ------

جرسی اور نیویارک کو ملانے والی اس طویل سرنگ کے باہر کاروں کی لمبی قطاریں موجود تھیں

ہم بھی ایک ایسی قطار میں لگ گئے!

کیا مجال جو کسی نے کسی کا حق مارا ہو!

کیا مجال جو کوئی کسی کے راستے کی دیوار بنا ہو!

یہ دنیا کے مصروف ترین لوگ تھے۔

اور ہم شاید فارغ ترین ------

آپ نے وہ لطیفہ تو سنا ہو گا کہ ایک سیاح نے دنیا کے بہت سے ملکوں کی سیاحت کی اور اپنا سفر نامہ لکھا جس کی خوبی یہ تھی کہ وہاں ہر ملک کے لوگوں کے عادات نفسیات اور مسائل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

موصوف پاکستان کے متعلق فرماتے ہیں کہ میں پاکستان کے شہر لاہور کی مصروف شاہراہ مال روڈ کے ریگل چوک میں پہنچا جہاں ایک ہجوم اکٹھا تھا ----- میں نے ایک صاحب سے استفسار کیا--

کیا بات ہے یہاں اتنا مجمع کیوں لگا ہے؟

انہوں نے فرمایا کہ ابھی دو آدمیوں میں جھگڑا ہو گیا تھا۔

میں نے پوچھا وہ کہاں گئے۔

ان صاحب نے فرمایا کہ وہ دونوں تو کبھی کے چلے گئے یہ تو وہ لوگ ہیں جو تماشا دیکھنے جمع ہوئے تھے۔

ممکن ہے اس حکایت میں کچھ مبالغہ رہا ہو۔

لیکن ---

یہ حقیقت کے قریب ترین حکایت ہے۔ واقعی ہم لوگ اتنے ہی فارغ ہیں۔ آج بھی ہمارے شہروں میں کوئی بھی مداری ڈگڈگی بجا کر سو دو سو کا مجمع اکٹھا کر سکتا ہے۔

اور اگر آپ کو ڈھنگ سے ڈگڈگی بجانا آجائے ۔ آپ بندروں کا تماشہ دکھانے میں کمال حاصل کر لیں تو یہی تعداد پھر سینکڑوں سے ہزاروں اور کئی کئی لاکھوں میں پہنچ جاتی ہے اور ان لاکھوں جمع ہونے والوں کو علم ہی نہیں ہو پاتا کہ کب تماشا شروع ہوا' کب ختم ہو گیا۔-----

بے چارے ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے دیکھتے رہتے ہیں اور

ع .... تماشا دکھا کر مداری گیا

کے مصداق مداری صاحب جو کوئی نہ کوئی سیاسی یا مذہبی نعرہ لگا کر مجمع اکٹھا کرتے ہیں۔ مطلب نکل آنے پر چپ چاپ اپنا راستہ ناپتے ہیں اور یہ بے چارے پھر تبصرے کرتے یا کڑھتے رہتے ہیں۔

پاکستانی مداریو خدا تمہیں سمجھے۔

خدا کرے جلد تم مکافات عمل کی گرفت میں آجاؤ پھر ہم دیکھیں گے تمہاری ہوشیاریاں چالبازیاں اور مکاریاں تمہیں کس طرح بچا سکیں گی----

خدا وہ دن جلد لائے جب ہم تمہارے حال پر ہنسیں۔

جس طرح آج تم ہمیں بے وقوف بنا کر اپنی نجی محفلوں میں ہم پر ہنستے ہو۔

○

"ہالینڈ ٹنل کے باہر ہر کوئی جلدی میں تھا۔

لیکن-----

کس کو جلدی نہیں تھی۔

کوئی افراتفری کا مظاہرہ نہیں ہو رہا تھا۔

ہر کوئی اپنی باری آنے پر ہی آگے بڑھتا تھا اور اس ترتیب اور تنظیم کی وجہ سے جلدی ہی سب کی باری بھی آ گئی۔

مین ہٹن کی پندرھویں سٹریٹ پر بے چینی سے روپ ہمارا منتظر تھا۔

ڈاکٹر گریوال نے روپ کو فون کر کے صرف اتنا بتایا تھا کہ ساگر صاحب اور بچے آ رہے ہیں نہ تو اس بے چارے کو ہمارے وقت کا علم تھا نہ ہی اندازہ بس یونہی اس نے سوچا کہ ہم تین چار بجے تک پہنچ جائیں گے اور ہم پہنچ بھی گئے۔۔

رابعہ اور نمیر کی آنکھ کھل گئی تھی۔

دونوں بچے کھلی آنکھوں سے کبھی روپ کو اور کبھی میری طرف دیکھ رہے تھے کہ یہ کون سا اجنبی میرے اور ان کے درمیان آگیا۔ میں نے روپ کا تعارف ایک دوست کی حیثیت سے کروایا اور بچوں کو بتایا کہ اب یہی ہمارے ہوسٹ بھی ہیں------ "پہلے کہاں چلیں گے"۔

روپ نے اپنے کمپارٹمنٹ میں ہمارے سامنے امریکن سٹائل کا معمولی سا ڈنر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"پہلے آرام کریں گے"

"ایمپائر سٹیٹ"

میں نے پہلی اور رابعہ نے دوسری چوائس چھٹتے ہی بتائی

میں نے تو آرام کا مشورہ طاہرہ کے لئے دیا تھا جو یہاں تک ڈرائیونگ کرتی آئی تھی۔

لیکن۔

یہ میرا حسن ظن تھا کہ وہ تھکی ہوئی ہے حالانکہ وہ تازہ دم۔

ع..... چلنے کو تیار بیٹھے ہیں۔

کے مصداق ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کی موڈ میں نہیں تھی۔

ہم دونوں معمول کے مطابق بحث کرنے لگے میں اسے اپنی اور وہ مجھے اپنی بات منوانے پر تلی تھی۔

"میرے پاس ایک تجویز ہے جس سے آپ دونوں مطمئن رہیں گے"----

روپ کے جر کا پیمانہ چھلکا-----

"کیا؟"

میرے بجائے رابعہ نے پوچھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جب تک ہم دنوں کے پاس موجود دلائل ختم نہیں ہوں گے ہم بحث میں لگے رہیں گے

"اس وقت پانچ بجے ہیں ہم سات بجے چلیں گے۔ ایمپائر سٹیٹ".......

"یار وہ دیکھی ہوئی ہے"۔ میں نے درمیان سے اس کی بات ٹوک دی۔

"جی ہاں دن میں -----لیکن رات کو اس کے دیکھنے کا مزہ ہی اور ہے"----- روپ نے مجھے مطمئن کیا۔

رابعہ اور طاہرہ نے فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملا دی نمیر میرا اور میں اس کا منہ دیکھنے لگے۔

فلم ایکٹر طالش جیسے پھولے ہوئے گالوں والے ننھے نمیر کو میں نے گود میں اٹھا کر اس کے گالوں پر دو زبردست بوسے دے کر اس کی خاموش حمایت کا شکریہ ادا کیا اور

ع.... سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

کہہ کر روپ کی طرف دیکھتے ہوئے ہتھیار پھینک دیے

نیو یارک کے ففتھ ایونیو کی ۳۴ ویں سٹریٹ پر واقع ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کو رات میں دیکھنے کا تجربہ میری زندگی کا شاندار اور ناقابل فراموش تجربہ ثابت ہوا۔

روپ اپنی لنکن میں بیٹھا کر ہمیں یہاں تک لایا تھا۔ اس کے گھر سے یہاں تک میں خود کو لنکن کے گداز گدوں والی سیٹوں میں دھنستا محسوس کر رہا تھا ---

ٹکٹ خرید کر ہم لوگ لابی میں پہنچ گئے----

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کی لابی آرٹ کے خوبصورت شاہکاروں سے مزین ہے جرمن بلجیم اٹلی اور فرانس کی پہاڑیوں سے تراشے گئے سنگ مرمر کا بہترین استعمال اس لابی میں دیکھنے کو ملتا ہے----- گو کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر' کینیڈی سنٹر اور نیویارک کی کچھ اور عمارتوں میں بھی یہی خوبصورت اور قیمتی پتھر استعمال کیا گیا ہے۔

لیکن ---

اس لابی کی ایک خصوصیت جو اسے دیگر عمارتوں کی لابیوں سے ممتاز کرتی ہے۔ یہاں "رائے سپار کیا" اور اس کی آرٹسٹ بیوی کی شاندار پینٹنگز ہیں۔ جو لابی میں چاروں طرف دیوار میں سجی ہر آنے والے سے اپنا آپ منواتی اور خراج تحسین حاصل کرتی ہیں۔

میں اس سے پہلے دن میں یہاں آچکا تھا۔

لیکن----

یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ رات کو یہاں آنے والے سیاحوں کی تعداد دن میں

آنے والوں سے زیادہ نظر آ رہی تھی۔

شاید اس کی وجہ "ویک اینڈ" بھی ہو کیونکہ آج ہفتے کی رات تھی۔

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ میں یوں تو ۷۳ تیز رفتار لفٹیں لگی ہیں جو پلک جھپکتے میں آپ کو ۳۲۰ میٹر کی بلندی پر لی جاتی ہیں

لیکن-----

ان لفٹوں کے سامنے اکثر قطار لگی نظر آتی ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں آنے والوں کی تعداد کیا ہوتی ہوگی۔ ایک اندازے کے مطابق ۵۰ لاکھ افراد سالانہ ان لفٹوں کے ذریعے ایمپائر سٹیٹ پر جاتے ہیں----

ہم بھی "کیو" میں لگ گئے-----

چند منٹ بعد ایک تیز رفتار لفٹ ہمیں بلڈنگ کی ۸۶ ویں منزل پر لے گئی یوں تو ایمپائر بلڈنگ کی اوپر کی ۳۰ منزلوں کو بھی رات کے ۹ بجے سے ۱۱ بجے تک رنگ و نور اور روشنیوں کے سیلاب میں نہلایا جاتا ہے اور ان لمحات میں یہ بلڈنگ نیویارک کی دیگر بلڈنگوں مین بالکل اس طرح سجی دھجی نظر آتی ہے جیسے اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں دلہن -----

۸۶ ویں منزل پر قدم رکھتے ہی آنکھیں خیرہ ہونے لگی تھیں---!!

ونڈر فل--- سپلنڈڈ---- سبحان اللہ - میرے منہ سے بے ساختہ نجانے کیا کیا نکل رہا تھا۔

بے اختیار میری زبان اس منظر کو خراج تحسین پیش کر رہی تھی۔

لفٹ سے باہر نکلتے ہی یوں لگا جیسے میں روشنی اور رنگوں کے کسی خوبصورت جزیرے پر اتر گیا ہوں--

میرے چاروں اطراف آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی رنگ برنگی روشنیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ پھیلتا چلا جا رہا تھا۔

بالکنی کے مختلف کونوں میں لفب طاقتور دوربینوں میں کوارٹر (امریکی چونی) ڈالنے

سے آپ چند منٹ تک ارد گرد کا نظارہ کر سکتے ہیں

ان دوربینوں کے لئے بھی ہمیں "کیو" میں کھڑا ہونا پڑا اس ضمن میں عقلمندی یہ ہوئی کہ ہم نے ایک ہی جگہ کھڑے ہونے کے بجائے تین مختلف قطاروں میں اپنے اپنے لئے جگہ بنائی۔

بمشکل پانچ چھ منٹ بعد ہی میری باری آئی اور جیسے ہی سکہ ڈالنے پر دوربین ان ایکشن ہوئی میں نے اسے نادیدہ بچوں کی طرح چاروں طرف گھمانا شروع کر دیا۔

چاروں طرف میری آنکھوں کے سامنے رنگ برنگ پھلجڑیاں پھوٹ رہی تھی۔ کہیں یہ روشیاں مجھے اپنے پہلو سے اور کہیں زمین سے پھوٹتی دکھائی دیتیں اور پھر آسمان تک پھیلتی چلی جاتیں۔

تاحد نگاہ رنگ و نور کا ایک سیلاب بیکراں تھا کہ جس میں میں بھی بہتا جا رہا تھا۔

نیویارک کے بڑے بڑے پلوں پر لرزتی روشیاں-----

ایمپائر سٹیٹ کے دائیں بائیں پھیلتی آسمان کی بلندیوں کو چھوتی بلڈنگوں سے چنگاریں پھوٹتی دکھائی دے رہی تھیں۔

ائر پورٹ پر لینڈ کرتے اور چڑھتے جہازوں کی دم سے آگ نکلتی تھی اور سمندر میں کھڑے دیوہیکل جہاز جو یہاں سے معمولی کشتیاں دکھائی دیتے تھے کے سروں پر موم بتی کی لو کی طرح روشنیاں لہرا رہی تھیں۔

روشنیوں کا ایک جہان میرے چاروں طرف آباد تھا۔

میں اب تک تین مرتبہ دوربین میں سکے ڈال کر اس منظر سے لطف اندوز ہو چکا تھا---

میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ خوبصورت خواب ٹوٹ جائے جس میں میرا وجود فضائے بسیط کی بیکراں وسعتوں میں اڑتا چلا جا رہا تھا---

میرے تن سے آزاد ہو کر میری روح نے ایک خوبصورت سفید پرندے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ بالکل ویسے ہی خوبصورت ننھے ننھے سفید پروں والے فرشتے

جیسی جو کرسمس کے کارڈوں پر بنے ہوتے ہیں-----!!

اس لمحے مجھے طاہرہ کی کار میں بجنے والے اس گیت کی لائن یاد آ گئی جس میں کوئی منچلی مغنیہ مجھے کہہ رہی تھی۔

OPEN YOUR WINGS AND FLY.

اور میں سوچ رہا تھا۔

زندگی کے اس ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں۔ خوشیوں اور مسرتوں کے کتنے بے شمار جزیرے ہیں جو مجھے اپنی سمت بلا رہے ہیں۔

لیکن -----

میں تہی دست ---اتنی استطاعت بھی نہیں رکھتا تھا کہ ان خواب جزیروں تک اڑ کر پہنچ سکوں جہاں خوشیاں میری منتظر تھیں---

اس لمحے مجھے ادراک ہوا کہ انسان واقعی نا شکرا ہے------نا مطمئن اور اپنے ہی پیدا کردہ آسیبوں میں گھرا بے بس انسان اپنے لئے کتنے دکھ مصیبتیں اور بے قراریاں پیدا کرتا چلا جاتا ہے-----

قدرت کی عطا کردہ نعمتوں پر شاکی رہنے والا انسان نہیں جانتا کہ زندگی کا دامن خوشیوں سے لبا لب بھرا ہے اور اس کی تنگ نظری نے اس کا دامن بھی اتنا تنگ کر دیا ہے کہ اپنے حصے کی خوشیاں بھی ڈھنگ سے حاصل نہیں کر پاتا۔

بس کر جاؤ بابیو! پھلیاں تے رحم کرو"---- میرے تعاقب میں ابھرنے والی روپ کی آواز نے خواب جزیرے سے اٹھا کر مجھے پھر اس مرتی مارتی دنیا میں لا پھینکا۔

مجھے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ میرے پیچھے لگی قطار لمبی ہوتی جا رہی ہے۔

"کچھ انجوائے بھی کیا" ---- طاہرہ نے پوچھا جو میری طرح ابھی اس منظر سے لطف اندوز ہونے کے بعد ادھر آئی تھی۔

"ہاں بہت کچھ" ----- میں نے کہا---- "طاہرہ! خوشیوں اور آگہی کے لمحات ہمیشہ مختصر ہوتے ہیں لیکن بڑے پائیدار اور جاں فزا-------"

"کجھ ساڈے پلے وی پا دیئو بابیو" روپ نے مجھے سیریس دیکھ کر ماحول بدلنے کی کوشش کی۔

جے میں ویکھاں اپنے وَلے
کجھ نہیں میرے پلے
جے میں ویکھاں تیرے وَلے
بلے بلے بلے ----!!

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ پر کھڑے اس لمحے نجانے میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا ----

روپ سنگھ نے ان لائنوں کو بہت انجوائے کیا ----

○

ہمارے شمال کی جانب مشہور عالم راک فیلر سنٹر تھا جو اپنی بہت سی دیگر خصوصیات کے علاوہ ایک خاص بات کے لئے بھی شہرت رکھتا ہے کہ کرسمس کے موقعے پر یہاں سے بہت بڑا کرسمس ٹری برآمد ہوتا ہے----

اس روائتی درخت کو دیکھنے کے لئے جس کے ساتھ ہزاروں روشنیاں چھوٹی چھوٹی مرچوں کی طرح ٹمٹا رہی ہوتی ہیں لاکھوں تماشائی ارد گرد گلیوں اور بازاروں میں بیٹھے ہوتے ہیں اور اس درخت کی روشنیاں جب باہر نکال کر جلاتی جاتی ہیں تو ساری فضا تالیوں اور خوشیوں کے نعروں سے گونج اٹھتی ہے۔

یہاں سے برآمد ہونے والا کرسمس ٹری نزدیک ہی "**سینٹ پیٹرک کیتھیڈرل**" پر لایا جاتا ہے۔

راک فیلر کے شمال میں نیو یارک کا مشہور سنٹرل پارک اور جنوب میں نیو یارک پبلک لائبریری موجود ہے۔

سنٹرل پارک کی مغربی سمت میں نیو یارک کلوزیم اور لنکن سنٹر اور پارک کے شمال کی سمت میں ذرا آگے میٹروپولیٹن میوزیم آف آرٹس۔

یہ عمارات نیو یارک کی ۵۷ سٹریٹ سے ۷۲ ویں سٹریٹ تک پھیلتی چلی جاتی ہیں۔

۶۹ ویں سٹریٹ سے ۹۶ ویں سٹریٹ تک تمام علاقہ "براڈ وے" ہے۔ اور یہ براڈ وے سنٹرل پارک کے متوازی چلتی چلی جاتی ہے۔ اس سمت میں ہی آگے مشہور زمانہ کولمبیا یونیورسٹی آجاتی ہے۔

روپ کو تو جیسے نیو یارک کا سارا جغرافیہ حفظ تھا۔ میں اور طاہرہ اس کا منہ دیکھ رہے تھے اور دونوں بچے ہماری طرف متوجہ تھے۔۔۔۔!!

وہ جو سامنے روشنیوں کا پنگھوڑا جھول رہا تھا وہ دریائے ہڈسن پر بنا جارج واشنگٹن برج ہے جہاں اکثر ٹریفک سٹک stuck ہو جاتی ہے اور اس کے شمال میں بالکل برونکس کے اندر یانکی سٹیڈیم ۔۔۔۔!

"کجھ پلے وی پے رہیا جے مہاراج"۔۔۔۔ اس نے ایک لمحے کے لئے رک کر نمیر کے ہاتھ میں پکڑے چپس کے پیکٹ سے کچھ چپس نکال کر منہ میں ڈالے اور دوبارہ ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔

"پہلے اپنی مونچھیں صاف کر لو"۔۔۔۔ میں نے جیب سے نیپکن نکال کر اسے تھما دیا۔

"شکریہ میاں جی" ۔۔۔۔ کاغذ کا نیپکن تھامتے ہوئے پنجاب کے جیالے جاٹ نے قہقہ لگایا۔

"ہمارے ایسٹ میں پین ایم بلڈنگ تو آپ لوگوں کو نظر آہی رہی ہے جس پر جلتی روشنیوں میں پین ایم لکھا ہے ۔۔۔۔۔"

"یار جو ہمیں نظر آ رہا ہے وہ بتانا کیا ضروری ہے۔ بس یہی کمی ہے تم لوگوں میں" میں نے کہا۔

"اچھا شکر اے رب دا ساڈے ویر نے آخر عینک دا نمبر بدلا ای لیا"۔ وہ بھی کہاں چپکا بیٹھنے والا تھا۔

پین ایم کے پہلے گرینڈ سنٹرل ٹرمینل کا ایک کونا جگمگا رہا ہے۔ مشرق میں کرسلر بلڈنگ سے آگے جو ٹاور دکھائی دے رہا ہے وہ یو این او جنرل اسمبلی کا ٹاور ہے۔ اور اس کے آگے جو قوس و قزح پھوٹ رہی ہے وہ روز و یلسٹ کا جزیرہ ہے جس پر کوئینز برو برج ایستادہ ہے۔

اس کے شمال میں بہت دور ٹرائے برو برج جس "ایسٹ ریور" پر بنا ہے اس میں "وارڈ آئی لینڈ اور رینڈلز آئی لینڈ" کے خواب جزیرے آباد ہیں جو امریکن کروڑ پتیوں کے مسکن ہیں۔

"ٹرائے برو برج" "برونکس" کو کوئینز سے اور "کوئینز برو برج" پھر مین ہٹن اور کوئینز کے درمیان رابطہ قائم رکھے ہوئے ہے۔۔۔۔۔!

"اور وہ جو سامنے ائر پورٹ نظر آ رہا ہے"۔۔۔۔۔

"جے ایف کینڈی ہو گا"۔۔۔۔۔ میں نے اس کی بات کاٹی۔

"اب تم ہمارے والی غلطی دھرا رہے ہو۔۔۔۔۔ میاں صاحب جس بات کا پتہ نہ ہو پوچھ لیا کرتے ہیں یہ "لوگارڈیا ایئرپورٹ" ہے۔۔۔۔۔"

جے ایف کینڈی نہیں اس کی باری آئے گی تو بتا دوں گا۔

"اچھا اچھا۔۔۔۔ بس زیادہ قابلیت نہ جتایا کرو بچوں کے سامنے"۔۔۔۔۔ میرے اور روپ کے درمیان خاصی بے تکلفی پہلے سے قائم تھی۔

"اب ذرا اس طرف آجاؤ یہ بالکونی کی جنوبی سمت ہے"۔۔۔۔ اس نے ہمیں دوسرے کونے میں لے جا کر کھڑا کر دیا اور ہاتھ کی انگلی سے سامنے اشارہ کرنے لگا۔

اس طرف میٹروپولیٹن لائف بلڈنگ' میڈیسن سکوئر پارک اور ٹوائے سنٹر ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہیں اور ان کے آگے نیویارک لائف بلڈنگ ہے۔

"اور وہ گرینج و یلج" ------ میں نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

طاہرہ نمیر کو باتھ روم میں لے گئی تھی اور ہم دونوں اکیلے ہی یہاں کھڑے تھے۔

"بڑا شوق ہے دیکھنے کا---- واشنگٹن سکوائر کے جنوب مغرب میں ہے تمہارا گرینج و یلج"

گرینج و یلج بھی ایک دیکھنے کی چیز ہے ---- شریف آدمیوں کے لئے تو صرف جاننے کی۔ اسے امریکہ کے مادر پدر آزاد طلباء طالبات نے آباد کیا تھا۔ آپ اسے بے حیائی کے شاہکار رومانٹک گاؤں کی حیثیت سے جان سکتے ہیں۔

اس گاؤں کا گرمائی میلہ جو سال میں ایک مرتبہ لگتا ہے البتہ دیکھا جا سکتا ہے۔ بس یوں جانئے جیسے ہمارے پنجاب کے روائتی میلے ہوتے ہیں جہاں فٹ پاتھ پر چٹپٹی چٹخارے دار کھانے پینے کی اشیاء اور نالے پراندے سے لے کر کنگھی شیشہ تک یہاں بکتا ہے۔ بالکل میلوں کے سے انداز میں۔

اس میلے کو اگر "ستی بیئر میلہ" کہا جائے تو زیادہ مناسب لگتا ہے۔-----"

کیونکہ یہاں آنے والے مادر پدر آزاد خواتین و حضرات ستی بیئر کے ٹنوں پر شہد کی مکھیوں کی طرح جھپٹتے ہیں اور کئی کئی ٹن غٹا غٹ چڑھا جاتے ہیں جس کے بعد پھر وہ کچھ دیکھنے کو ملتا ہے کہ جس کے متعلق بقول شاعر یہی کہا جا سکتا ہے کہ۔

ع آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

گرینج و یلج کے جنوب میں مشہور زمانہ "وول ورتھ بلڈنگ" موجود ہے جسے شاپنگ سنٹر ہی کہا جائے گا لیکن یہاں دنیا کی کوئی ایسے شے نہیں جو نہ ملتی ہو مثلاً آپ نے ٹافی کھانی ہے تو وہ بھی موجود اور اگر پلنگ درکار ہے تو وہ بھی حاضر----

جو دل چاہے لیجئے۔

جتنا دل چاہے لیجئے۔

لیکن ——

شرط یہی ہے کہ آپ کے پاس شاپنگ کے لئے رقم یعنی ڈالروں کی فراوانی ہونی چاہئے اس کے نزدیک ہی ویلمزبرگ برج ہے جو کوئینز سے شروع ہوتا اور ڈی لیسی سٹریٹ تک چلا جاتا ہے اس کے جنوب میں گرینڈ سٹریٹ۔

بروکلین اور مین ہٹن دونوں برج اس طرح تعمیر کئے گئے ہیں کہ اس بلندی سے دیکھنے پر ایک دوسرے کے بالکل متوازی نظر آتے ہیں---- مین ہٹن برج کا خاتمہ نیویارک کے چائنا ٹاؤن پر ہوتا ہے----

اور وہ جسے آپ جناب جے ایف کے ایئرپورٹ سمجھ رہے تھے یہاں نہیں بلکہ بروک لین کے آخری سرے پر موجود ہے۔

بروک لین بیٹری ٹنل سے تو آپ گزر ہی چکے ہیں جو زیر آب تعمیر کیا گیا ہے اور جو سیدھا ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر جاتا ہے۔

طاہرہ اس دوران واپس آگئی تھی۔

"آؤ اب تمہیں ویسٹ سائیڈ بھی دکھا دوں کیا کہتے ہیں مغربی سمت تم بھی کیا یاد کرو گے کس سکھ سے پالا پڑا تھا"-----

اب ہم بالکونی کی مغربی سمت میں کھڑے تھے۔ طاہرہ بچوں اور ہمارے لئے "وینڈنگ مشین" سے خاصا الم غلم نکال لائی تھی۔ روپ نے فوراً جوس کاٹن کھولا اور دو تین سانسوں میں ہی غٹا غٹ چڑھا گیا۔

"یہ ہے مہاراج آر۔ ایچ۔ میسی اینڈ کمپنی جس کے "آؤٹ لٹ" سٹور سے آپ نے سیل میں پچھلی مرتبہ کوٹ خریدا تھا---- یار! ساگر معلوم نہیں تم نے ابھی تک یہ شاپنگ پلازہ کیوں وزٹ نہیں کیا۔ حالانکہ جس طرح وہ کہتے ہیں ناں کہ جس نے

لاہور نہیں دیکھا کچھ نہیں دیکھا۔ اس طرح نیویارک آکر اگر کسی نے میسی نہیں دیکھا تو کچھ نہیں دیکھا۔

یار! یہ دنیا کا سب سے بڑا ڈیپارٹمنٹل سٹور ہے۔ کرسمس کے موقع پر "فلوٹ پریڈ" کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے ----

"مجھے علم ہے انکل" ---- رابعہ کو پہلی مرتبہ اپنی معلومات جتانے کا موقعہ ملا تھا----

"اس فلوٹ میں کرسمس بیلون' مکی ماؤس' پوپائے دی سیلر اور سینٹا بھی ہوتے ہیں----"

"بالکل وہی گڈی۔ بالکل وہی" ---- روپ نے اس کے گال تھپتھپائے۔

امریکہ میں پریڈیں بہت ہوتی ہیں۔ یہاں نیویارک میں دو پریڈیں مشہور ہیں۔

پہلی کولمبس ڈے پریڈ جو امریکہ دریافت کرنے والے کولمبس کو یاد رکھنے کے لئے مناتے ہیں۔

دوسری اہم پریڈ یہاں کی "سینٹ پیٹریکس ڈے" نامی ایک مذہبی پریڈ ہے جسے اگر آئرش پریڈ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کیونکہ اس میں زیادہ تعداد میں آئرش باشندے امریکہ کے کونے کونے سے آکر حصہ لیتے ہیں----

○

"بس کرو یار۔ نہ نیویارک کی عمارتیں ختم ہوں گی نہ تمہاری زبان رکے گی---- میں نے نیویارک کے جغرافیے کا امتحان نہیں دینا آؤ کچھ کھالیں"

میں نے روپ سے کہا کیونکہ اس درمیان رابعہ تین چار دفعہ مجھے احساس دلا چکی تھی کہ کھانے کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ سے ہم نکلے اور مین ہٹن پر ایک پارکنگ میں کھڑی روپ کی کار لے کر بروک لین کی طرف آ گئے------

بروک لین بھی اب لندن کا ساؤتھ ہال بنتا جا رہا ہے۔

کچھ سٹریٹس تو یہاں پاکستانی اور ایشیائی ہوٹلوں ہی کے لئے مختص ہو کر رہ گئی تھیں

"شاہین میں چلیں------" مجھے ایک ہی نام یاد تھا--

"نہیں یار آج تمہیں ایک اور مسلمان بھائی کے ہوٹل میں لے جاتے ہیں"

-----روپ نے کہا اور ہم پاکیزہ میں آ گئے----!

چھوٹے سے تندور نما ہوٹل میں پھنسی پھنسائی چھ سات میزوں میں سے آدھی خالی تھیں

"گھبرا نہ جانا--- یہ دراصل ٹیک اے وے ہے جگہ کم ہونے کی وجہ سے لوگ پیک کروا کر لے جاتے ہیں --- یہ میزیں تو تمہارے جیسے مسافروں کے لئے ہیں جو دوسرے شہروں سے یہاں آتے ہیں" ----روپ نے کہا۔

"اچھا یار اب کچھ سوچنے بھی دو---"

طاہرہ اور بچے ایک بنچ پر اور روپ میرے ساتھ دوسرے بنچ پر بیٹھ گیا--- میں آرڈر پلیس کرنے کے لئے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے اس درمیانی عمر کے نوجوان کی طرف بڑھا جس کے کھڑے ہونے، بولنے اور دیکھنے کا انداز چغلی کھا رہا تھا کہ اس کا کوئی نہ کوئی حوالہ مجھ سے بھی بنتا ہے۔

اس کے سامنے شیشے کے کیس میں سجے کھانوں پر ایک نظر ڈالنے سے یوں لگتا تھا کہ ہم لاہور کے کسی تنور نما ریسٹورنٹ میں آ گئے ہیں۔ ایسے ریسٹورنٹ جو اپنے ذائقہ کے لئے خاص شہرت رکھتے ہیں لیکن وہاں بیٹھنے کے لئے ڈھنگ کی جگہ نہیں ہوتی۔

میں نے حلال کھانے دیکھ کر اچھا خاصا آرڈر دے دیا۔

"سرجی! نیویارک ہی رہندے او---" اس نے پہلی مرتبہ ہمیں دیکھا تھا۔

"نہیں بھاجی --- فلاڈلفیا توں آئے آں-----" میں نے کہا۔

تعارف کا سلسلہ شروع ہو گیا اور جب میں نے اسے بتایا کہ میں اندرون شہر لاہور کا رہنے والا ہوں تو اس نے بڑے فخر سے بتایا کہ وہ لوہاری کے شیخ سویٹس والے شیخ صاحب کا بھائی ہے---

گو کہ یہ معمول کی بات تھی---

لیکن ----

خدا شاہد ہے اس لمحے "پاکیزہ" کے شیخ صاحب کے چہرے پر جو زندگی چمکی تھی یہی زندگی کا امر لمحہ تھا۔

اپنے وطن' زمین اور ماحول سے آدمی کٹ جائے۔

کیسے ممکن ہے؟

جڑیں سوکھ جاتی ہیں۔

درخت جل جاتے ہیں۔

اپنی زمین سے کٹ کر جینے والے سات سمندر پار کے ان مکینوں کو اگر زندہ رکھا ہوا ہے تو رشتوں کے اس تقدس اور حوالے نے ----

یہ لوگ وہ ہیں جو ہماری روایات کی طرح کھرے اور سچے ہیں یہ تو حوادث زمانہ ہیں جو ان کو لاہور کی گلیوں سے اڑا کر نیویارک کی سٹریٹس پر لے آتے ہیں۔

ان کی اصلیت نہیں بدلی۔

امریکہ میں یہ پاکستانی پاکستان کا مان ہیں۔

جب کبھی پاکستان پر قہر کی کوئی آندھی ٹوٹے ۔

جب کشمیر پر غاصب بھارتیوں کی یلغار ہو------

یہ لوگ اپنا سب کچھ تج کر' سب کچھ چھوڑ کر۔ نیویارک کے کسی ایونیو کے

سامنے یو این او کے سامنے ' کسی پارک میں ' کسی سٹریٹ پر سراپا احتجاج بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ان میں وہ بھی شامل ہیں جو پانچ چھ سال سے اپنے گھروں کو واپس نہیں لوٹے لیکن وہ بیقرار ہو جاتے ہیں۔

تڑپ اٹھتے ہیں۔

جب انہیں خبر ملتی ہے کہ پاکستان پر کوئی قیامت ٹوٹ گئی ہے۔

میں جانتا ہوں ان لوگوں نے زبردستی امریکہ سے اپنا رشتہ باندھا ہوا ہے۔

ایک روز کچے دھاگے کی طرح یہ رشتہ ٹوٹ جائے گا اور پنچھی اپنے گھروں کو واپس لوٹ آئیں گے-----!!

شیخ صاحب کو میں نے جب بتایا کہ میرے سسرال ان کے محلے دار ہیں اور ان کا تعارف کروایا تو وہ بیقرار ہو کر کاؤنٹر سے باہر آئے اور مجھ سے بغل گیر ہو گئے----

○

میں نے بل زبردستی ادا کیا تھا کیونکہ وہ پیسے نہیں لے رہے تھے۔ یہ جھوٹا وعدہ کر کے میں نے انہیں پے منٹ کی تھی کہ میں اگلی مرتبہ ان کا مہمان بن کر آؤں گا---- شیخ صاحب نے بڑی بد دلی سے بل وصول کیا تھا-----!!

رات کے گیارہ بج رہے تھے جب ہم روپ سنگھ کے اپارٹمنٹ کی طرف رین بسیرا کرنے جا رہے تھے کیونکہ ہمیں اگلے روز یعنی اتوار کی دوپہر کو واپس جانا تھا-----!!

روپ سنگھ نے ڈیش بورڈ میں رکھا کیسٹ ٹیپ ریکارڈر میں لگا دیا۔ کمال کی چوائس تھی---- روپ کی کار نیو یارک کے براڈوے پر بھاگ رہی تھی اور اقبال

بانو کی آواز دھیمے سروں میں میرے رگ و پے میں اتر رہی تھی۔

دل کے دریا کو کسی روز اتر جانا ہے۔
اتنا بے سمت نہ چل لوٹ کے گھر آنا ہے

○

اگلے روز ہم نے سنٹرل پارک جانے کا پروگرام بنایا تھا۔۔۔۔۔۔

میں تو پہلے بھی یہاں کی خاک چھان چکا تھا لیکن رابعہ بیٹی کے جذبات ملحوظ خاطر رکھنا بھی ضروری تھا۔

سنٹرل پارک سے بڑے اسرار وابستہ ہیں۔۔۔۔۔

آپ جس وقت بھی چلے جائیں آپ کو جاگنگ کرتے خواتین و حضرات ضرور دکھائی دیں گے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ امریکنوں پر جاگنگ کرنے کا جنون سوار رہتا ہے۔

دن ہو یا رات
صبح ہو یا شام۔

کسی بھی وقت آپ کو امریکہ کی کسی بھی سڑک اور پارک میں کوئی نہ کوئی امریکی جاگنگ کرتا ضرور نظر آئے گا۔

سنٹرل پارک سے بڑی کہانیاں جڑی ہیں۔ یہاں آئے روز کوئی نہ کوئی قتل ہوتا رہتا ہے۔۔۔۔ اس کے باوجود کہ گھڑ سوار پولیس کا گشت یہاں ۲۴ گھنٹے جاری رہتا ہے۔۔۔

لیکن۔۔۔۔

آئے روز کسی نہ کسی ٹیکسی ڈرائیور کو لوٹنے کی واردات بھی ہوتی رہتی ہے۔

مہینے میں ایک آدھ مرتبہ کسی خاتون کو ریپ کرنے کے بعد قتل کر کے بھی یہاں پھینک دیا جاتا ہے اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ راہ چلتے درختوں کے طویل سلسلوں میں کہیں کسی موڑ پر اچانک کوئی کالا چاقو لہراتا آپ کے سامنے آئے اور حکم دے گا۔

"پیسے نکالو"------

اب جان کی امان اسی صورت ملے گی جب آپ اس کو "ٹپ" دے دیں گے بصورت دیگر آپ کی جان بھی جا سکتی ہے اور مال تو جائے گا ہی-----

امریکی اس معاملے میں بڑے عقلمند ہیں' اگر کہیں ایسا واقعہ پیش آجائے فوراً لٹیرے کی ڈیمانڈ پوری کر دیں گے کبھی اس کے سامنے ہیرو بننے کی کوشش نہیں کریں گے۔ یہ جو ہم ہالی وڈ کی فلموں میں ویت نام سے لوٹنے والے فوجی کی کہانی دیکھا کرتے ہیں جو اکثر غنڈوں کے گروہوں سے ٹکرا جاتا ہے اور پھر ان کو ادھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔

خواتین و حضرات! کبھی ان فلموں سے متاثر ہو کر امریکہ کے لٹیرے کے سامنے ہیرو بننے کی کوشش نہ کریں۔

ہم نے تو خدا جھوٹ نہ بلوائے ویت نام کے ان ہیروز کو تین حالتوں ہی میں دیکھا ہے۔

(۱) اپنی سابقہ وردی پہن کر امریکہ کے مختلف شہروں میں بھیک مانگتے۔

(۲) واشنگٹن میموریل کے سامنے چندہ اکٹھے کرتے۔

(۳) ویت نام ویٹرنز میموریل VIETNAM VETERANS MEMORIAL واشنگٹن میں پتھروں پر گڑے ناموں پر ہاتھ پھیر کر یا ناموں کی ان تختیوں کے سامنے پھول رکھ کر روتے ہوئے۔

ہالی وڈ کی فلموں والے جیالے کم از کم مجھے کہیں دکھائی نہیں دیئے۔

سنٹرل پارک کے ایک خاصے آباد اور محفوظ کونے میں روپ میں طاہرہ اور بچے بیٹھے اس چائے سے دل بہلا رہے تھے جو طاہرہ روپ کے گھر سے اپنے ہاتھوں بنا کر لائی تھی-----!!

ایک بوڑھا ٹھیلا گھسیٹتا ہماری طرف آ رہا تھا-----!!

اس کے سر پر اس کے نحیف و نزار جسم سے زیادہ بھاری ہیٹ موجود تھا۔ لمبے کوٹ میلی کچیلی پتلون اور پھٹے ہوئے بوٹوں کے ساتھ وہ ٹھیلا گھسیٹتا سیدھا ہماری طرف آیا۔

ٹن بیئر سر!

ٹن بیئر میم -(میڈم)

اس نے بڑی پر امید نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

"نو --- تھینک یو" ---- میں نے فوراً جواب دے دیا۔

"آئی ایم ساری۔ اولڈ گائی" ----- روپ نے کف افسوس ملا۔

"جہنم میں جاؤ تم سب۔ گدھے۔ بدتہذیب۔ بے شعور جانے کہاں سے آجاتے ہیں یونائیٹڈ سٹیٹس میں"-----

بوڑھا امریکی ہمیں مغلظات بکتا چلا گیا۔

حیرت کی بات تھی کہ روپ سنگھ کو غصہ نہیں آیا-----

اس کے بعد تو مجھے بھی کبھی امریکنوں کی گالیوں پر غصہ نہیں آیا۔ کیونکہ گالی تو ان کمبختوں کی زبان پر دھری ہوتی ہے اور ایک خاص لفظ (فحاشی کے خوف سے لکھ نہیں سکتا) تو اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسے کہنے پر دس نیکیاں کما رہے ہوں----

مجھے طاہرہ نے بتایا کہ اگر کوئی امریکی پولیس والا آپ کو "ٹکٹ" دے۔ یعنی جرمانہ کر دے اور آپ کو غصہ آجائے تو بے دھڑک اسے بے نقط سناتے چلے جایئے۔ وہ دانت نکالتا رہے گا یا چپ چاپ اپنی راہ لے گا۔

لیکن -----

ایک احتیاط ہمیشہ ملحوظ خاطر رہے کہ کبھی بھول کر بھی اس کے جسم کو ہاتھ نہیں لگانا ورنہ وہ درگت بنے گی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

امریکنوں کی بعض باتیں مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آسکیں---- ایک تو یہ کم بخت EMBARESS بہت جلدی ہو جاتے ہیں-----

ان کی FEALINGS فوراً HURT ہونے لگتی ہیں۔

اور مہذب ترین امریکی بھی گالی دینا اپنا حق سمجھتا ہے۔

ان کے مزاج کے ذرا خلاف کچھ ہو جائے ٹھک سے گالی دے دیں گے----- ہماری طرح کڑھتے نہیں۔

شاید اس معاشرے میں کڑھنے کا تصور ہی نہیں پایا جاتا۔

یہ لوگ فوراً" اپنی بھڑاس نکال لیتے ہیں بھلے اپنے بیڈ روم کے گدوں پر نکالیں یا باورچی خانے پر------

لیکن کچھ ادھار نہیں رکھتے۔

فلاڈلفیا کی ساؤتھ سٹریٹ سے ہم **"فرینکلن ملز"** جا رہے تھے---

گاڑی حسب سابق طاہرہ چلا رہی تھی۔ طاہرہ کو امریکہ میں شاپنگ کی چمپیئن کا اعزاز حاصل ہے۔ میرا خیال ہے جو چیز آپ کو امریکہ میں ۱۰ تا ۲۵ ڈالر کے درمیان ملتی ہے طاہرہ آپ کو ضرور کسی ایسے سٹور پر لے جائے گی جہاں یہی شے آپ کو صرف ۵ ڈالر میں مل سکتی ہے۔

ساؤتھ سٹریٹ سے **فرینکلن** ملز کا فاصلہ قریباً آدھ گھنٹے کی ڈرائیو ہے----

میں پہلی مرتبہ ملز جا رہا تھا اور جب یہاں پہنچا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ میرے خیال سے تو یہ کوئی کپڑے وغیرہ کی مل یا ان کا سیل ڈپو ہو گا۔

لیکن ----

یہ تو دنیا کے بڑے شاپنگ پلازہ میں سے ایک تھا۔

داخلے کے لئے تین دروازے ہیں۔ ایک دروازے سے داخل ہوں تو "جے سے پینی" کا بوڈز سامنے نظر آتا ہے۔

دوسرے دروازے سے داخل ہونے پر "میسی" نظر آئے گا۔ اور تیسرے دروازے سے داخل ہوں تو ٹوائز آر اس TOYS- R -US بچوں کا سٹور دکھائی دے گا----

ہم یہاں شاپنگ کرنے آئے تھے اور وہ بھی سستی شاپنگ---- مجھے طاہرہ نے بتایا تھا کہ امریکہ کے جتنے بھی بڑے سٹور ہیں ان کے آوٹ لٹ OUT LET سٹور

بھی ہوتے ہیں۔

ان آؤٹ لٹ سٹورز میں اس کمپنی کا مال فروخت ہوتا ہے لیکن بی کیٹگری میں ----- ممکن ہے ان لوگوں نے اے اور بی کا کوئی فرق رکھا ہو لیکن مجھے تو نظر نہیں آیا--- بس وہ جسے ہم پنجابی میں "نخرہ" کہتے ہیں ایسی کوئی بات ضرور رہی ہو گی۔

امریکہ میں شاپنگ کا ڈھنگ آجائے تو کیا کہنے۔

لیکن----

عام حالت میں آپ پھر بمشکل ایک آدھ پتلون یا قمیص ہی خرید سکتے ہیں اگر آپ بہت امیر آدمی نہیں ہیں۔ اگر آپ کو خریداری کا طریقہ آجائے جیسا کہ میں نے طاہرہ سے سیکھا تو آپ کو پاکستانی بھاؤ پر اشیائے ضرورت یہاں سے مل سکتی ہیں۔

میں آپ کو "فرینکلن" کی مثال دیتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے بتایا اس مل کو آپ بے شمار سٹورز کا مجموعہ سمجھ لیجئے۔ ایک چھت کے نیچے امریکہ کے درجنوں سٹورز اکٹھے کر کے اس مجموعے کا نام فلاڈلفیا میں "فرینکلن ملز" رکھا گیا ہے۔

ہم "جے سی پینی" والے دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے اندر جاتے ہی دائیں بازو پر آپ کو "پیزا پارلر" دکھائی دے گا۔

یہاں ایک لطیفہ سنا دوں تو اسے دخل در نا معقولات نہ جانیئے۔ امریکہ میں پیزا کھا کھا کر اس کا ذائقہ منہ کو لگ گیا تھا۔

لاہور میں کبھی کبھی پیزا کھانے کو جی چاہتا تھا۔ اب ہم کوئی ایسے رئیس زادے تو ہیں نہیں کہ کسی فائیو سٹار میں اپنا شوق پورا کر سکتے۔ دوستوں نے ایک دو ٹھکانے لاہور میں بتائے کہ وہاں آزما دیکھو۔

لیکن -----

کچھ خاص مزا نہ آیا بس نقل ہی کی گئی تھی۔

ایک روز میں بچوں کے ساتھ لاہور کے ایک بڑے ہی ماڈرن رہائشی علاقے میں کسی کام سے گیا تھا کہ وہاں PIZA PARLER کا بورڈ دکھائی دیا۔

"وہ مارا"----- دل نے کہا۔

امریکہ میں "پیزا ہٹ" اور "پیزا پارلر" پیزے کے دو انتہائی معتبر نام ہیں یہاں لوگ بطور خاص پیزا کھانے جاتے ہیں۔

میں نے یہی سمجھا کہ شاید نج کاری کے کسی پروگرام کے تحت یہاں بھی امریکنوں نے اپنی دکان کھول لی ہے۔

بچوں کے ساتھ مطلوبہ ریسٹورنٹ پہنچے بالکل امریکن ماحول۔ اسی انداز سے میزیں اور کرسیاں لگی ہیں----- اور سجاوٹ بھی اس طرح کی گئی ہے۔ خیر بیٹھنے پر بیرے نے ہمارے سامنے جو مینو رکھا----- اگر مجھے یہ علم نہ ہوتا کہ یہ پاکستان ہے تو میں حلفاً کہہ سکتا تھا کہ ہم امریکن پیزے کی دکان پر بیٹھے ہیں۔

یقین کیجئے صد فی صد PIZA HUT کی کاپی تھی۔ بالکل اسی انداز میں مختلف انداز سے پیزے اور خصوصی فرمائش پر خاص "ٹاپنگ" لکھی تھی۔

ہم نے دھڑلے سے آرڈر دے دیا۔

بچوں نے الگ سے کچھ منگوایا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بیرے نے مطلوبہ آرڈر سامنے لا کر رکھ دیا۔ بچوں نے تو جیسے تیسے "ہیم برگر" کے نام پر آنے والے سلائس زہرمار کرنے شروع کر دیئے۔

اپنی بے وقوفی کا کچھ اندازہ تو یہ سٹف دیکھ کر ہو ہی گیا تھا لیکن ابھی کچھ کسر باقی تھی۔ میں نے دل کڑا کر کے بیرے سے پوچھا کہ حضور والا پیزا کہاں ہے۔

اس نے ادائے بے نیازی سے سٹیل کی پلیٹ میں رکھی بسکٹ نما چیز کی طرف اشارہ کر دیا۔

میں نے کہا برادر میں نے "پیزا" منگوایا تھا۔

بیرے نے کہا جناب ہم کوئی چکن پیس نہیں لائے۔ پیزا ہی لائے ہیں۔

بحث بے کار تھی۔ دل پر پتھر رکھ کر بل ادا کیا اور اونچی دکان پھیکے پکوان کا ورد کرتے باہر آ گئے۔

دل نے کہا اگر امریکن "پیزا پارلر" والوں کو اس بات کا علم ہو کہ ان کے نام کی یہ درگت بن رہی ہے تو چلو بھر پانی میں ڈوب مریں۔

○

پیزا پارلر کے ساتھ ہی فاسٹ فوڈ کی مشہور کمپنیوں کے سٹال سجے تھے امریکن یہ سمجھتے ہیں کہ کسی بھی جگہ آنے والا کوئی بھی شخص بھوکا' پیاسا ضرور ہو گا اس لئے ہر قابل ذکر جگہ پر آپ کو اس کا بندوبست نظر آئے گا۔

کسی شاپنگ سنٹر میں جایئے کپڑوں اور جوتیوں کی قطاروں سے گذر کر ایک کونے میں کوئی فاسٹ فوڈ کی دکان ضرور لگی ہو گی۔

ایک بات تو یہی سمجھ میں آتی ہے کہ اتنے طویل و عریض سٹوروں کا ایک چکر لگا کر ہی آدمی کو بھوک یا پیاس ستانے لگتی ہے شاید اسی لئے اس کا انتظام کیا جاتا ہے۔

بات کچھ بھی رہی ہو۔ ایک بات برملا کہی جا سکتی ہے کہ امریکہ کے کسی بھی کونے میں' کسی بھی سٹریٹ پر' پلازہ پر' ایونیو پر' آپ کو چار باتوں کے لئے کبھی زحمت برداشت نہیں کرنی پڑے گی۔

باتھ روم کے لئے۔

سواری کے لئے۔

ٹیلی فون کے لئے۔

کھانے پینے کے لئے۔

ان چاروں معاملات میں امریکن ضرورت سے زیادہ خود کفیل ہو چکے ہیں اور انسانی سہولیات میں نت نئے اضافے ہو رہے ہیں۔

ہائی وے پر سفر کرتے ہوئے آپ کو کسی بھی قسم کی دقت پیش نہیں آسکتی۔ کار خراب ہونے سے طبیعت خراب ہونے تک کے تمام مراحل سے آپ بااحسن طریقے سے نمٹ سکتے ہیں۔

○

فرینکلن ملز میں جس گیٹ سے ہم داخل ہوئے تھے وہاں سے داخل ہونے والے تمام لوگ چونکہ پہلے کھانے پینے کی اشیاء کی طرف بھی جاتے تھے سو ہم بھی ان کی تقلید میں ادھر ہی مڑ گئے۔ "سوڈے" کے نام پر برف کا گلاس ہاتھ میں تھام کر وہیں ایک کونے میں کرسی پر براجمان ہو گئے۔

امریکی سافٹ ڈرنکس کو "سوڈا" کہتے ہیں۔

یہاں شرفا کے لئے تین چیزیں ہوتی ہیں۔

سوڈا، جوس، کافی یا چائے۔

لیکن -----

سوڈے کی کتنی اقسام ہیں شاید کسی امریکی کو بھی ان کی تعداد یاد نہ ہو۔ ہمیں تو کوکا کولا، آر سی، پیپسی، سیون اپ، وغیرہ کا ہی علم تھا یہاں تو سینکڑوں ورائٹیز موجود ہیں۔

لیمونیڈ سے جینجر ایل اے تک---- سینکڑوں اقسام کے سینکڑوں ذائقوں والے سوڈے موجود ہیں۔

اسی طرح جوس کو لیجئے۔

ٹماٹر کے جوس سے لے کر سنگترے کے اصلی جوس تک ہمہ اقسام کے جوس موجود ہیں۔

چائے بھی ہماری طرح کی نہیں۔ ہاٹ، آئسڈ ٹی، لیمن ٹی اور نجانے کون کون سی ٹی۔

کافی البتہ ٹھنڈی اور گرم دو ہی قسم کی ہوتی ہے۔

اگر آپ تھوڑے سے "ترقی یافتہ" ہیں تو پھر ہمہ اقسام بیئرز موجود ہیں۔

اس سے آگے کا بیان ہمارے بس کی بات نہیں۔

○

طاہرہ پہلے فرینکلن مل میں "ڈالر سٹور" پر لے گئی۔

"ارے واہ! وہ مارا"---- میں نے دل ہی دل میں کہا۔

یہاں موجود ہر شے کی قیمت ایک ڈالر تھی۔ گو کہ ایسے ایک دو سٹور میں نے اس سے پہلے اٹلانٹک سٹی میں بھی دیکھے تھے۔

لیکن ----

اتنی بے تحاشہ ورائٹی وہاں موجود نہیں تھی۔ یہاں تو بے شمار چوائس موجود تھی۔ میں نے بھی ندیدے بچوں کی طرح دو شاپنگ بیگ بھر لئے۔

بہر کیف میں تیسری دنیا کا باشندہ تھا۔

غیر ترقی یافتہ ملک کا رہنے والا۔

میں جانتا تھا جب واپس جاؤں گا۔ سب امریکہ کا تحفہ مانگیں گے تو مانگنے والا خالی ہاتھ کیوں جائے۔

الم غلم قسم کے پرفیوم' آفٹر شیو' سگریٹ لائیٹر۔ امریکہ کی مہریں ہونی چاہیے امریکن پیکنگ ہی کافی ہے۔

وہاں کسی نے دیکھنا تھا اس کے اندر کیا بند ہے-----

میں نے سوچا میں کہاں پندرہ پندرہ بیس بیس ڈالر کی قمیص خرید تا پھروں گا یہ ٹھیک ہے-----

اور -----

بلا شبہ یہ بڑا کامیاب تجربہ رہا----

طاہرہ تمہارا بے حد شکریہ۔

"ڈالر سٹور" سے خریداری کرنے کے بعد جب ہم باہر نکلے تو میں نے سب سے پہلے سامنے کونے میں ستانے کے لئے رکھے دو بنچ سنبھال لئے اور تمام اشیاء پر سے قیمت کی سلپیں اتار کر وہیں رکھے ڈبے میں "ٹریش" کر دیں۔

اب مجھے بالکل آزادی میسر تھی۔ جس چیز کی جو قیمت چاہوں اپنے ذہن میں مقرر کر لوں۔

○

لاہور میں ہر سال صنعتی نمائش لگتی ہے۔

اس مرتبہ ہم بھی سارے گھر والے اکٹھے ہو کر چلے گئے۔

خریداری کیا کرنی تھی مقصد تو آؤٹنگ کرنا ہوتا ہے کہ چار بچوں کی سیر بھی ہو جائے گی اور وہ اپنے ہم جماعتوں کے سامنے نمائش دیکھنے کے مسئلے پر سرخرو ہوں گے شرمندگی کا شکار ہونے سے بچ جائیں گے------

ماشاء اللہ یہاں سینکڑوں دکانیں سجی تھیں۔

لیکن -----!

مسلسل پیدل چلنے سے بچوں کی تو کیا بڑوں کی بھی سانس پھولنے لگی تھی۔ انتہائی افسوس اور حیرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ساری نمائش گاہ میں کسی ایک سٹال پر تھکے ہوئے شائقین کے بیٹھنے کے لئے ایک کرسی بھی موجود نہیں تھی۔

چھوٹی بیٹی اور ایک خاتون کو جب بہت زیادہ تھک گئی تھیں ہم نے خدا خدا کر کے ایک برتنوں کی دکان میں رکھی کرسیوں پر بٹھا دیا تاکہ خود آگے جا کر شاپنگ کر لیں اور واپسی پر انہیں ساتھ لے لیں گے----!

قریباً پندرہ بیس منٹ بعد ایک دوسرے سٹال سے شاپنگ کر کے جب ہم واپس آئے تو میری بیٹی رونی صورت بنائے دکان کے باہر خاتون سمیت کھڑی تھی۔

"خیریت بھئی! اگر کھڑے ہونے کا شوق ہی چرایا تھا تو پیدل چلنے میں کیا مضائقہ تھا؟"

میں نے اپنی بیٹی سے پوچھا۔

"بیٹھے بیٹھے دل بھر آیا تھا۔ آپ یاد آنے لگے تھے اسی لئے اٹھ کر باہر آ گئے۔۔۔۔۔" صاحبزادی نے روہانسی آواز میں کہا۔

"جناب آپ کے جانے کے تین چار منٹ بعد ہی دکان کے منتظمین میں سے ایک صاحب تشریف لائے اور ہمارے وہاں بیٹھنے کا سبب دریافت کیا۔ بیٹھنے کا جو جواز ہم نے پیش کیا وہ انہیں پسند نہیں آیا فرمانے لگے آپ باہر تشریف لے جائیں یہ تو ہمارے گاہکوں کے لئے ہے۔۔۔۔۔۔ تب سے اب تک ہم باہر کھڑے آنے جانے والوں پر حسرت کی نظر کر رہے تھے کہ کب آپ کا دل نمائش کی سیر سے بھرے اور ہم گاڑی تک پہنچ کر اپنی ٹانگیں سیدھی کریں۔۔۔۔۔۔" خاتون نے خود پر بیتنے والی قیامت کا احوال سناتے ہوئے کہا۔

میں نے بطور خاص اس بات کا جائزہ لیا کہ آخر کسی کونے میں تو بچوں۔ خواتین یا بزرگوں کے ستانے کے لئے بینچ' کرسیاں وغیرہ رکھی ہوں گی۔۔۔۔۔ خدا خدا کر کے نمائش کے دروازے کے مین دروازے سے کچھ فاصلے پر تین چار بینچ نظر آئے جن پر چند مشٹنڈے اور کچھ پولیس ملازمین استراحت فرما رہے تھے۔

ہزاروں کی تعداد میں اس روز صنعتی نمائش میں بچے' بوڑھے' عورتیں اور جوان موجود تھے لیکن خدا کی پناہ منتظمین کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اس مسئلے پر بھی غور کرتے۔

اصل میں یہی وہ بظاہر چھوٹی چھوٹی لیکن اصل میں بہت بڑی بڑی باتیں ہیں جو

کسی بھی قوم کی عظمت یا ذلالت پر دلالت کرتی ہیں۔

امریکہ میں آپ کوئی دکان نہیں بنا سکتے اگر اس میں گاہکوں کے لئے باتھ روم نہیں بنایا گیا--------

انتظامیہ کی اجازت کے بغیر ایک انچ جگہ آگے پیچھے نہیں کر سکتے---------

منیاری کی دکان کو پکوڑے بیچنے کی دکان نہیں بنا سکتے---------

ایک چولھا انتظامیہ کی اجازت کے بغیر نہ تو لگا سکتے ہیں نہ ہٹا سکتے ہیں---------

ٹھیک ہے ہم کبھی کبھی کسی چوراہے پر سیمنٹ کا ڈبہ بنا کر اس پر پتھر کی سل لگا کر پانی کا ثواب اپنے مرحوم والدین کی روح کو پہنچانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ چند روز بعد ہی وہاں نصب پانی کی ٹوٹیاں غائب ہو جاتی ہیں یا پھر پانی کی لائن ہی کاٹ دی جاتی ہے---------

لیکن-----------

مہذب دنیا میں آپ کو قدم قدم پر تازہ' صاف پانی پینے کے لئے ملے گا دیگر سہولیات کا ذکر تو میں کر ہی چکا ہوں۔

○

صرف فرینکلن ملز دیکھنے کے لئے ہی سارا دن ناکافی ہے اور ہمارے پاس بمشکل تین چار گھنٹے تھے-------

دو تین مزید سٹوروں کی خاک چھاننے کے بعد ہم نے اپنے گھر کی راہ لی----

اگلے روز ویک اینڈ تھا۔

"ہم بچوں کے ساتھ پھر اس طرف چلے آئے اس مرتبہ طاہرہ نے گاڑی "ملز" کے بالکل سامنے "CARE FOR" پر پارک کی تھی۔

فلاڈلفیا کا یہ بہت مشہور اور آپ کے تصور سے بڑا سٹور ہے۔۔۔۔۔۔۔!

پہننے کے کپڑوں سے لے کر کھانے کی اشیاء تک تمام ضروریات زندگی ایک چھت کے نیچے میسر ہیں۔

"میاں صاحب اور طاہرہ نے "گاڑی بھر" کر شاپنگ کی۔

جی ہاں! اس سے کم شاپنگ یہاں نہیں کی جا سکتی۔ یہاں خریداری کرنے والے "ہتھ ریڑھیاں" بھرتے اور اپنی گاڑیوں میں انڈھیلتے چلے جاتے ہیں۔ پھر لدی پھندی گاڑیوں سمیت گھر پہنچ جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں اگر کسی صاحب کی جوتوں کی دکان پر گاہک آنے لگیں تو سب سے پہلے وہ اپنی دکان پر اپنے سر کے عین اوپر ایک چھوٹا سا بورڈ آویزاں کر دیں گے۔ جس پر لکھا ہوتا ہے کہ

"خریدا ہوا مال تبدیل یا واپس نہیں ہوگا

○

سیکورٹی والے معاملے کی طرح امریکن اس مسئلے پر بھی "عقل سے پیدل" نظر آتے ہیں انہوں نے تجارت کا کوئی سنہری اصول ہم سے مستعار نہیں لیا۔۔۔۔۔۔۔

کم از کم مجھے امریکہ یا یورپ کے کسی شاپنگ سنٹر پر تجارت کا یہ سنہری اصول آویزاں نظر نہیں آیا۔

اس کے برعکس ان کی "بیوقوفی" ملاحظہ فرمائیے۔

آپ کسی بھی جگہ سے کوئی بھی چیز خرید لیں اور ایک مہینے کے اندر واپس کر دیں۔۔۔۔ صاحب! نہ تو کوئی آپ سے واپس کرنے کی وجہ دریافت کرے گا نہ کوئی حیل و حجت کرے گا بلکہ آپ کا اس طرح شکریہ ادا کرے گا جس طرح فروخت کرتے وقت ادا کیا تھا۔

"آپ کو اسی طرح Blessing کرے گا جس طرح آپ کی آمد پر کی تھی۔

مجھے اس بات کا علم یوں ہوا کہ میں نے بھی "کیئر فور" سے ایک پتلون خرید لی تھی۔ سائز تو اپنا لیا تھا لیکن جب گھر پہنچ کر پہن کر دیکھی تو ٹانگوں میں کچھ پھنستی تھی۔ میں نے طاہرہ سے ذکر کیا تو اس نے کہا کوئی بات نہیں۔

"کوئی بات کیسے نہیں۔۔۔ میرے کسی عزیز کا میرے والا سائز نہیں کہ میں حاتم کی قبر پر لات مارتے ہوئے پندرہ ڈالر کی پتلون اس کو تھما دوں۔۔۔ جب تک میرا بیٹا اسے پہننے کے قابل ہو گا تب تک اس کی یا میری گارنٹی ختم ہو چکی ہو گی اور عین ممکن ہے کہ فیشن بھی بدل چکا ہو۔"

میں نے عندیہ ظاہر کیا۔

"جناب یہ واپس کر دیں گے" ۔۔۔ طاہرہ نے اطمینان سے کہا۔۔۔۔۔

"ایک مہینے کے اندر اندر اگر رسید تمہارے پاس ہے تو ہم اسے بغیر وجہ بتائے واپس کر سکتے ہیں۔۔۔۔"

اس کے بعد اس نے مجھے یہاں کے "اصول تجارت" سمجھانے شروع کر دئے۔

چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔۔۔۔۔۔۔۔

ہمیں بھلا کس طرح یقین آئے ہم نے تو ساری زندگی اپنے ملک میں اس کے برعکس اصول تجارت کارفرما دیکھا تھا۔

"لیکن میں نے تو اس پر موجود سارے گتے اکھاڑ کر پھینک دیے ہیں۔" میں

مکمل اطمینان چاہتا تھا۔

"پھر کیا ہوا بھئی۔۔۔ استعمال تو نہیں کی ناں۔۔۔ مطمئن رہو۔ اگلے ہفتے جائیں گے یا کوئی اور اس درمیان جائے گا تو واپس کر آئے گا۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"دل نہیں مانتا" میں بڑبڑایا۔

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ پرسوں میاں صاحب نے کچھ سامان خریدنے جانا ہے تم بھی چلنا اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا" طاہرہ نے جواب دیا۔

"واقعی صاحب! تین چار روز بعد ہم گئے سیدھے اس کاؤنٹر پر جہاں سامان واپس لوٹانے والوں کی قطار لگی تھی۔

ڈھلتی عمر کی ایک میم نے جسے بہت غور سے دیکھنے کے بعد ہی اس کی عمر کا اندازہ ہو سکتا تھا۔

مسکراتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا۔ پتلون کا نمبر رسید کے نمبر سے ملایا اور پندرہ ڈالر اور ایک "واپسی کی رسید" مجھے تھما دی۔

"تھینک یو"۔۔۔۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"یو ویل کم سر! You well come Sir اس نے لپ سٹک میں رنگے ہونٹوں پر مسکراہٹ جمائی اور اگلے گاہک کی طرف متوجہ ہو گئی۔

آپ امریکہ کے کسی بھی شاپنگ سنٹر سے کوئی چیز خریدیئے اور وہی چیز اگر ایک ماہ کے دوران کسی دوسری دکان پر آپ کی قیمت خرید سے زیادہ سستی ملے تو بلا جھجک پہلی دکان پر لوٹا کر یہاں سے سستی خرید لیجئے۔۔۔ اللہ اللہ خیر صلا۔۔۔ نہ کوئی لیتے ہوئے بھولے گا نہ دیتے ہوئے۔۔۔۔!

چند اشیاء مثلاً الیکٹرونکس کی کچھ چیزیں ایسی ضرور ہیں جن کی واپسی مشروط ہوتی ہے۔

○

فلاڈلفیا میں مجھے سب سے زیادہ پسند "K-Mart" نامی شاپنگ سٹور آتا ہے۔
کے مارٹ کو آپ اپنا جمعہ بازار سمجھ لیجئے۔
مجھے تو معلوم نہیں وہ کون لوگ ہیں جو امریکہ میں مہنگائی کا رونا روتے ہیں۔ بس آپ کو "فن خریداری" پر عبور ہو سب کچھ سستا مل جائے گا۔
کے مارٹ کا راستہ بھی پہلی مرتبہ ظاہر ہے طاہرہ نے ہی دکھایا تھا۔ ایک سہولت تو یہ تھی کہ اس سٹور کا فاصلہ طاہرہ کے گھر سے کچھ زیاہ نہیں تھا اور ہم بچوں کے ساتھ چہل قدمی کرتے وہاں پہنچ جاتے تھے۔
اب تو مجھے کے مارٹ کے سارے سیکشن حفظ ہو گئے ہیں۔ میں تو سیدھا سٹور میں گھستے ہی ان کونوں کھدروں میں پہنچ جاتا ہوں جہاں "سیل" لگی ہوتی ہے اور یہاں موجود اشیاء کی قیمت حیرت انگیز حد تک کم ہوتی ہے۔
اس کے بعد ہم اسی سے ملحقہ "پیتھ مارک" "ا یکمن" اور پھر "مسی" پر جاتے ہیں۔
طاہرہ کو علم ہے کہ "اصلی سیل" والا مال کس ٹوکرے میں پڑا ہے------!

○

میں تو اسے ٹوکرا ہی کہوں گا۔
بالکل ایسا ٹوکرا جیسا تماشہ دکھانے والے مداریوں کے پاس ہوتا ہے اور جس میں

سے وہ دوران تماشہ پھل فروٹ سے لے کر بندوق پستول تک ہر چیز برآمد کر کے دکھا دیتے ہیں۔

طاہرہ کو اس فن میں کمال حاصل ہے۔

اسے علم ہوتا ہے کہ کس کونے میں کوئی "ہتھ ریڑھی" سیل کے سامان سے بھری پڑی ہے۔ یہ سامان جس میں کپڑے، جوتے، خوشبو اور بچوں کے کھلونے تک موجود ہوتے ہیں اپنی دانست میں سٹور کے مالکان نے ناکارہ out of fashion یا out of date یا آؤٹ آف سیزن سمجھ کر پھینکا ہوتا ہے۔

ان بڑے بڑے سٹوروں کا اصول ہے کہ کسی بھی قابل فروخت شے کی کوئی بھی ورائٹی بہت زیادہ وافر مقدار میں لیتے ہیں۔ مثلاً ایک شرٹ جس پر مکی ماؤس یا کسی الو گدھے کی تصویر بنی ہے لاکھوں کی تعداد میں سیزن کے نزدیک خرید لیتے ہیں اور ملک بھر میں موجود اپنے تمام سٹورز پر پہنچا دیتے ہیں۔ اب سیزن میں تو اس کی قیمت تیس چالیس ڈالر ہوتی ہے۔

لیکن۔

اگلے سال کے آغاز یا اختتام پر امریکنوں کے مزاج کے مطابق یہ شرٹ ان کے ناک نہیں چڑھتی اور وہ اونے پونے داموں اسے ختم کرنے پر تل جاتے ہیں تاکہ اس کی جگہ سٹاک میں کوئی نیا ڈیزائین آ جائے۔ اس شرٹ کی فوراً سیل لگا دی جاتی ہے اور تیس چالیس ڈالر سے وہ دس پندرہ ڈالر کی ہو جاتی ہے۔

اب جناب ہوتا یہ ہے کہ فرض کیجئے دو تین ماہ تک سیل کے بعد بھی جو مال بچ جائے گا اسے یہ ان "طلسماتی ٹوکروں" میں پانچ ڈالر کا سٹکر لگا کر پھینک دیتے ہیں۔

آپ یہ نہ سمجھ لیجئے کہ کہیں خدانخواستہ شرٹ کی اصلیت یا کوالٹی بدل جاتی ہے امریکہ کے ان سٹوروں پر کبھی وہ چیز نہیں رکھی جاتی جس کی کوالٹی گھٹیا ہو۔ ایک دو سال نہیں پانچ دس سال بعد تک بھی "سٹف" خراب نہیں ہوتا۔ ہاں فیشن ضرور بدل

جاتا ہے۔

لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

یہاں بھی کمال کی بات یہ ہے کہ امریکہ میں روزانہ فیشن بدلتا ہے اور کوئی فیشن نہیں ہوتا۔

میری اس بات کو یوں سمجھئے کہ اگر آپ امریکہ میں تازہ ترین فیشن کی پتلون پہن کر گھومیں تو کسی کی صحت پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے ایک شخص جو آپ کے مقابلے میں نیکر پہن کر گھوم رہا ہے یا جس نے کپڑے کی کترنوں سے تیار کردہ پاجامہ نما نیکر پہن رکھی ہے اس کے فیشن کو بھی آپ کے مقابل حیثیت حاصل ہے۔

○

اس ضمن میں ایک قصہ گوش گذار کرتا چلوں

فلاڈلفیا میں ننھے نمیر سے میری عینک گر گئی اور اس کا ایک شیشہ تڑخ گیا۔

اس بری طرح تڑخا جیسے کبھی کبھی کار کی ونڈ سکرین تڑخا کرتی ہے اور اس پر یار لوگ نئی سکرین لگانے کے بجائے ٹیپ چپکا کر کام چلاتے ہیں۔

مجھے بڑی پریشانی ہوئی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ایسی غلطی ہوئی تھی کہ میں متبادل عینک نہیں لے کر گیا تھا۔

عام حالت میں دوران سفر میں ہمیشہ متبادل عینک پاس رکھا کرتا ہوں۔ اب کیا کیا جائے؟۔

طاہرہ مجھے براڈوے پر ایک عینکوں کی دکان پر لے آئی۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ اپنی عینک مالوکیٹوں کی طرح پلک جھپکتے شیشہ بدل دیں گے۔

لیکن۔

بسا اوقات انسانی ضابطے خود انسان کے لئے بھی باعث اذیت بن جاتے ہیں جیسے کبھی کبھی بہت زیادہ پچ نقصان دہ ہو جایا کرتا ہے۔

میں نے اپنی باری آنے پر دکاندار صاحب سے کہا کہ عینک کا ایک شیشہ تبدیل کروانا ہے۔

''آپ کے پاس ڈاکٹری نسخہ ہے'' اس نے سوال کیا۔

''برادر عزیز اس کی ضرورت کیا ہے۔ میں نے آنکھوں کی دوا نہیں لینی نہ ہی نظر چیک کروانی ہے آپ اپنے سامنے رکھی اس مشین میں میری عینک کو فٹ کر کے شیشے کا نمبر دیکھ لیں اور تڑخا ہوا شیشہ نکال کر نیا شیشہ فٹ کر کے چلتا کریں''۔

یہ تو بالکل ایسی ہی بات تھی جیسے کبھی کبھی رات کو فلم دیکھ کر یا ہسپتال سے کسی عزیز کی تیمار داری کے بعد لوٹنے والے خاوند صاحب کی موٹر سائیکل روک کر ہماری بہادر اور فرض شناس پولیس کے جوان پوچھا کرتے ہیں کہ پیچھے کس کو بٹھا رکھا ہے۔

جب آپ کہتے ہیں کہ یہ آپ کی زوجہ محترمہ ہیں تو اگلا سوال پوچھا جاتا ہے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ تمہاری بیوی ہے؟۔

آپ سٹپٹا کر یہی کہتے ہیں کہ میں نکاح نامہ تو جیب میں رکھ کر نہیں گھوم رہا۔

بالکل اسی طرح مجھے یہ تو علم نہیں تھا کہ امریکہ جا کر میری عینک کا شیشہ ٹوٹ جائے گا اس لئے اپنی نظر کا نسخہ بھی جیب میں رکھ کر گھوما کروں۔

گورے صاحب کے اس سوال نے مجھے گڑبڑا کر رکھ دیا۔

میں نے مزید کہا کہ جان عزیز میں پردیسی ہوں اور مجھے یہاں کے رولز اینڈ ریگولیشنز کا علم نہیں تھا پھر یہ کوئی ایسا بڑا مسئلہ بھی نہیں ہے ہمارے ملک میں تو چٹکی بجاتے ہی ایسے کام ہو جایا کرتے ہیں۔ مجھے کل نیویارک جانا ہے۔

اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ جناب والا اول تو اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں مشین میں نمبر چیک کر کے شیشہ لگا دوں۔

نمبر ۲: یہ کہ آپ کو ہمارے ڈاکٹر صاحب سے نظر ٹیسٹ کروانی ہو گی اور اس نسخے پر ہی شیشے لگیں گے۔

اور سب سے آخری بات کہ بہت جلدی بھی کریں تو اس میں کم از کم چار دن لگیں گے۔

اس سے پہلے آپ کو اپائنٹمنٹ نہیں مل سکتی۔ ڈاکٹر صاحب بہت مصروف ہیں۔

"لعنت ہو تم پر خدا کی مار" میں نے اسے اپنی مادری زبان میں کہہ دیا۔

"کیا فرمایا؟" اس نے انگریزی میں مسکرا کر پوچھا۔

"آپ کا شکریہ ادا کر رہے ہیں دراصل انہیں کل واپس جانا ہے۔" "تھینکس"

طاہرہ میرا ہاتھ پکڑ کر مسکراتی ہوئی باہر لے آئی۔

یہ تو تھی تمہید۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے واقعی دوسرے روز واشنگٹن کانگریس میں ڈین برٹن سے ملنا تھا۔

طاہرہ نے کہا کہ تین روز بعد لاہور سے اس کے ایک عزیز آرہے ہیں اپنے گھر فون کر دو کہ وہ تمہاری عینک ان کو پہنچا دیں۔ یہی سستا اور آسان ترین راستہ ہے یہاں کے میڈیکل قوانین بڑے پیچیدہ ہیں اور تمہیں تین چار روز سے پہلے عینک یوں بھی نہیں مل سکتی دو ڈھائی سو ڈالر بھی الگ اٹھ جائیں گے۔ جس میں اپنے ملک سے ایسی سو عینکیں خریدی جا سکتی ہیں۔

اس نے میری عینک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

لیکن مجھے تو؟۔

"تم اس کی پرواہ نہ کرو۔ امریکہ میں بھلے تم ایک شیشے والی عینک کے ساتھ گھومتے پھرو کوئی تمہاری طرف دھیان سے دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کرے گا"۔

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق میں نے اسی کی ہدایت پر عمل کیا اور خواتین و حضرات یقین کیجیے کہ اس ٹوٹے شیشے والی عینک کے ساتھ میں امریکی کانگریس اور

سینٹ میں گھومتا امریکی زعما سے ملاقاتیں کرتا رہا۔

کیا مجال جو کسی مرحلے پر مجھے احساس ہوا ہو کہ کوئی میری طرف غور سے دیکھ بھی رہا ہے؟۔

میں نے امریکہ کی بہت سے ائر لائنوں میں سفر کیا ہے ہم تو سوٹ بوٹ پہن کر اور نکٹائی باندھ کر گھٹے گھٹے اپنی سیٹ پر سمٹے سکڑے بیٹھے ہوتے ہیں۔

لیکن۔

ہمارے سامنے خواتین کے ساتھ ساتھ حضرات مسافر بھی اتنے مختصر لباس میں تشریف فرما ہوتے ہیں کہ بیان کی طاقت نہیں۔

کیا مجال جو کوئی ان پر ہنسا ہو۔

کیا مجال جو کسی نے کبھی ہمارے سوٹ بوٹ کی وجہ سے ہماری عزت کی ہو۔

یہاں عزت کے معیار ہی الگ ہیں۔

یہاں کے "مینوز" ہی نیارے ہیں۔

یہاں لباس، رنگ، شکل و شباہت کچھ باعث عزت نہیں۔

اگر آپ بہت بد صورت ہیں لیکن آپ کے اندر خوبصورتی موجود ہے تو آپ قابل عزت ہیں۔

بصورت دیگر بھلے آپ شہزادہ "گلفام" ہوں یا ہر وقت مسکراتے رہنے والی اداکارہ آپ کتنے ہی خوش لباس ہوں مادیت پرست معاشرہ ہونے کے سبب اپنے مطلب کے لئے تو کوئی بادل نخواستہ چند لمحے کے لئے آپ کی عزت کر لے گا۔

عام حالات میں آپ کی شکل مبارک پر کوئی تھوکنا بھی پسند نہیں کرے گا۔

یہ اس کھوکھلی سوسائٹی کی باتیں ہیں۔

یہ وہ کافر ہیں۔ جن کے سامنے ہم ہر وقت کشکول پھیلائے بھکاریوں کی طرح کھڑے رہتے ہیں۔

اب ذرا اپنی "اقدار" پر بھی نظر دوڑا لیجئے۔

ہمارے ہاں انسانی شرف اور عزت کے معیار کیا ہیں؟ دیکھ لیجئے۔

ہمارے دعوے ملاحظہ فرمایئے۔

کس کے پیرو کار کہلاتے ہیں ہم۔

اس نبی آخر الزمانؐ کے کہ جس نے عرب کے وحشیوں کو' انسان نما درندوں کو شرف انسانیت کے اس مرتبے پر بٹھا دیا کہ آج اپنے پرائے سارے عقیدت و احترام سے ان کا نام لیتے ہیں۔

ان کی مثالیں دی جاتی ہیں۔

میں آپ کو حلفاً کہہ رہا ہوں کہ کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر نے جسے "بظاہر کوئی complex نہیں تھا میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے متعدد مرتبہ فاروق اعظمؓ کا حوالہ دیا۔

صاحبو! بڑھکیں لگانے سے دنیا کو فتح نہیں کیا جا سکتا۔۔۔۔۔۔!!۔

اپنا گلہ ضرور خراب ہو جائے گا۔

دنیا کو مسخر کرنا ہے تو جس طرح عمر فاروقؓ نے دلوں کو مسخر کیا۔ کیجئے!!۔

صرف تنقید کر دینے یا امریکہ کو کافر یا سامراج کہہ دینے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا۔۔۔!۔

اسے مبالغہ نہ جانئے کہ جس امریکہ کو لعنت ملامت کرتے ہماری زبانیں نہیں تھکتیں اگر آج اس کے دروازے ہم پر مکمل کھل جائیں تو آدھا پاکستان امریکہ بھاگ جائے۔

انتہائی معذرت اور with all due respect ہاتھ باندھ کر عرض کر رہا ہوں کہ ہم نے دو ہی باتوں کو اپنا مقصد ٹھہرا لیا ہے ہمارے نوجوان امریکہ جاتے ہیں "گرین کارڈ" لینے۔

ہمارے حکمران امریکہ جاتے ہیں "گرین سگنل" لینے =
خدا ہمارے حال پر رحم فرمائے =

پروفیسر جعفر حسین سیّد

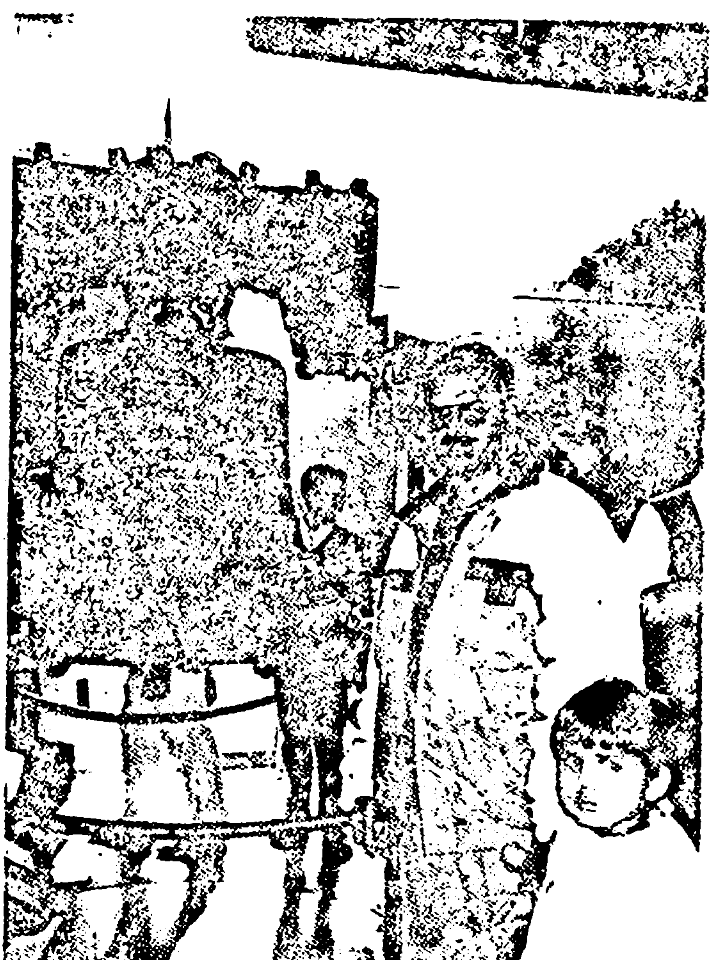

بیل آف لبرٹی فلاڈلفیا میں

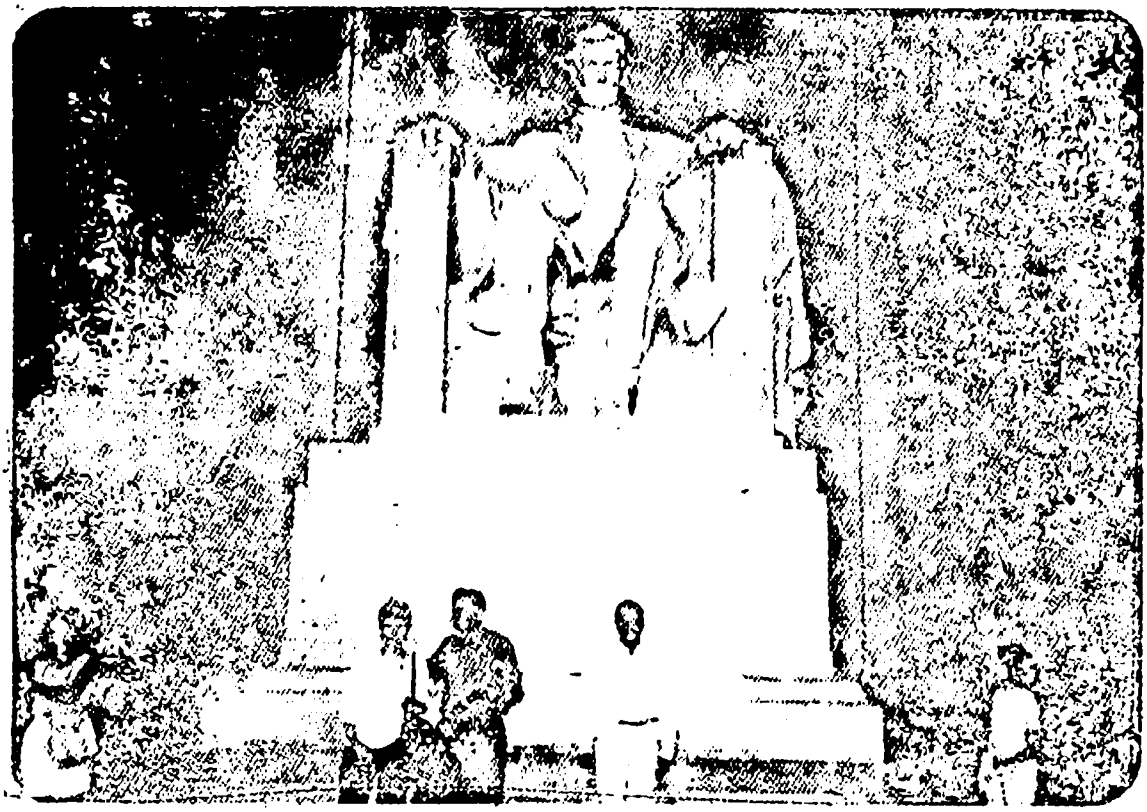

واشنگٹن میموریل

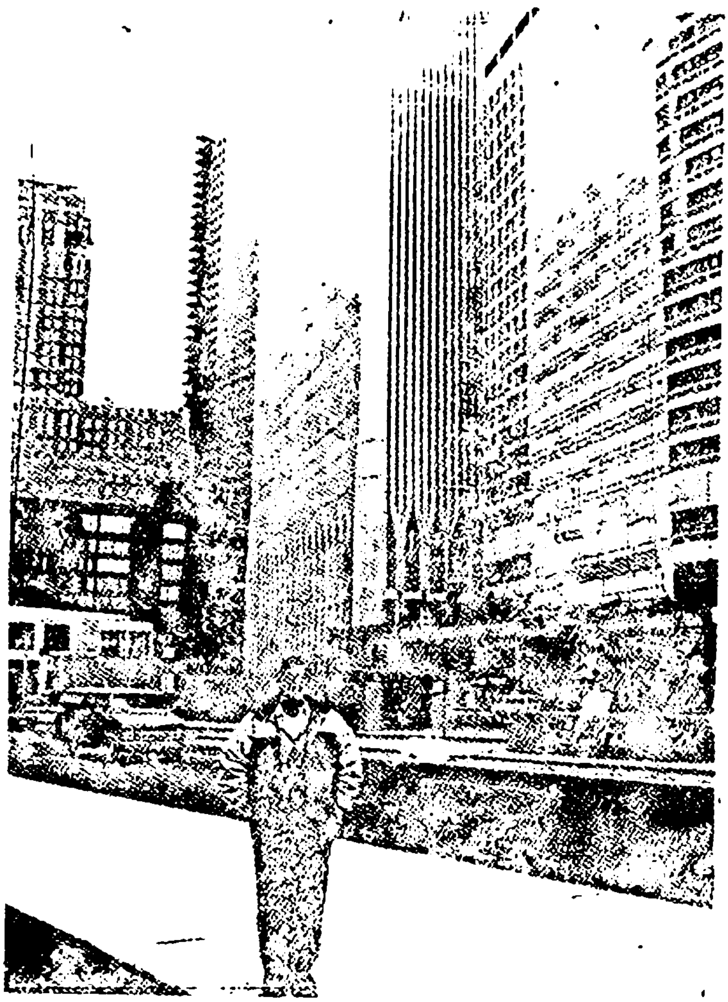

ورلڈ ٹریڈ سنٹر
نیو یارک

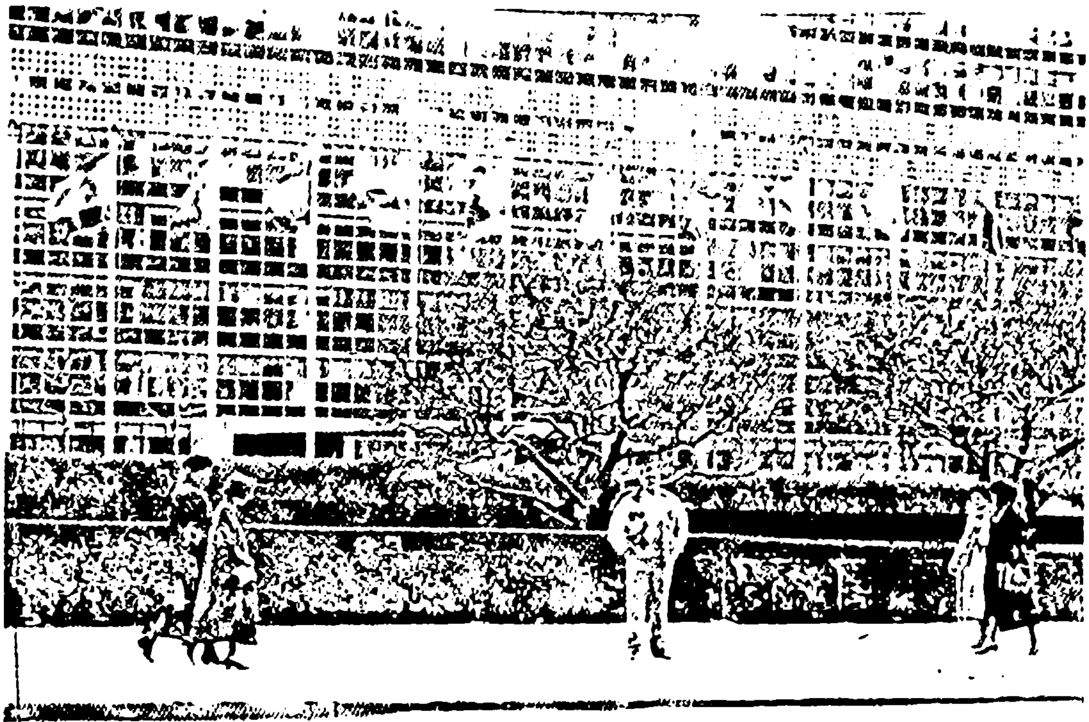

یو۔این۔او بلڈنگ نیویارک کے سامنے

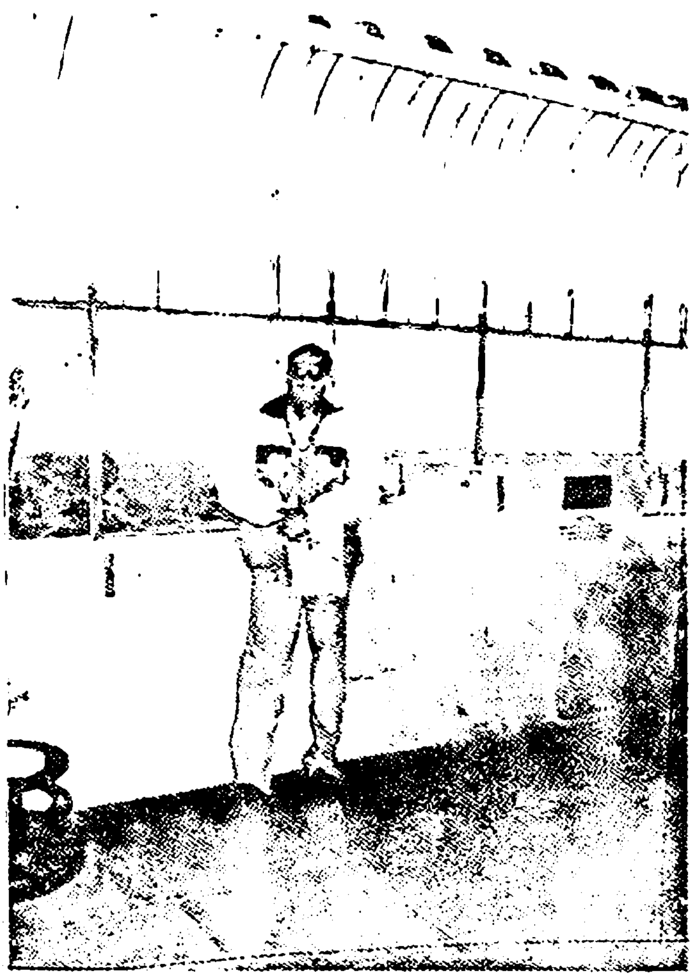

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ
کی
آخری منزل پر

فارن ریلیشنز. کمیٹی کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر لوئیر کے ساتھ

فلاڈلفیا کے مشہور
تجارتی مرکز
"گیلری"
میں
کرسمس ٹری
کے ساتھ

ریلو وسٹا کے یگ ہارن میں ورلڈ سکھ نیوز کے دوستوں کے ساتھ

"ڈاٹر آف ایسٹ" کے مصنف پیٹر گالبرائتھ کے ساتھ

سیکرامنٹو اولڈ سٹی کے ڈاک خانے کی انچارج اور پہلے آبادکاروں
کی تصاویر کے ساتھ

رچمنڈ ہل گوردوارے میں خطاب کرتے ہوئے

مصنف کے اعزاز میں سردار ڈھلوں کی طرف سے
دی گئی ضیافت کے شرکاء

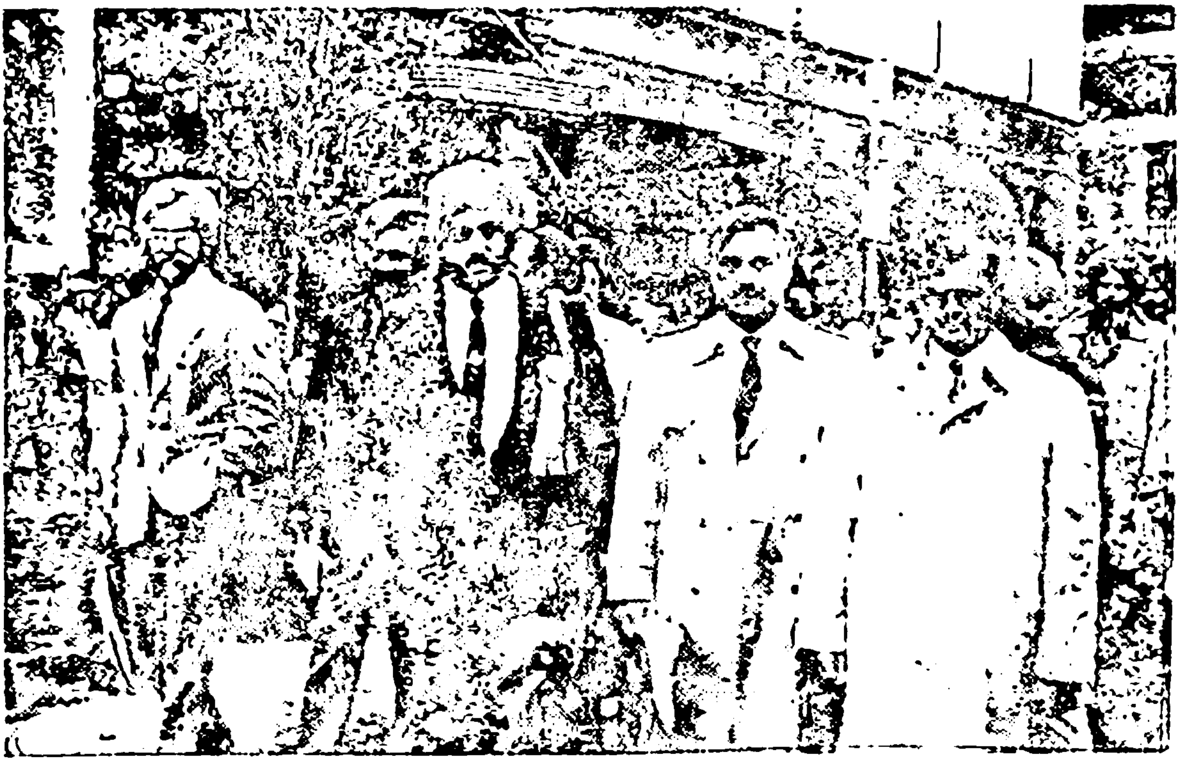

نیویارک میں کشمیریوں اور سکھوں کی مشترکہ
احتجاجی ریلی میں

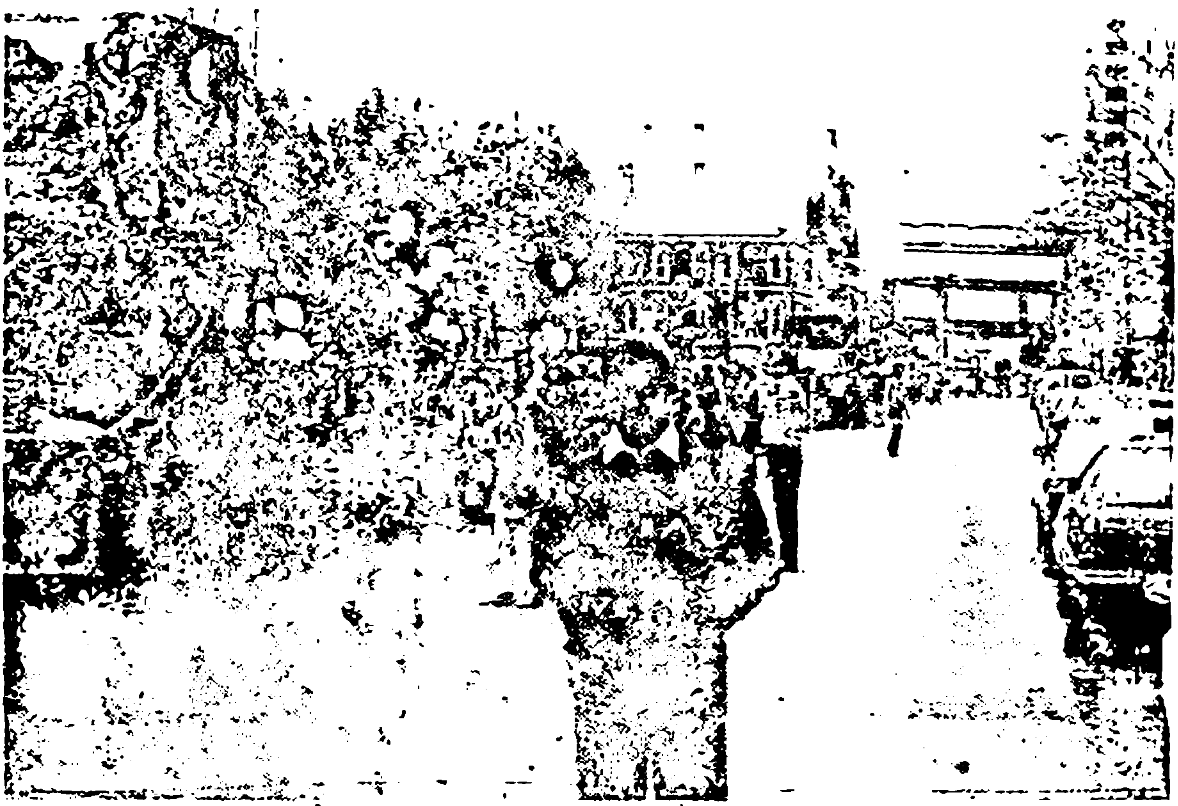

سان فرانسسکو کی مشہور سکھ پریڈ کے ساتھ